

DELHI UNIVERSITY LIBRARY

Cl. No. 0168, 3] NICA, 12 ^{EPU} N41

Ac. No. E1865

Date of release for loan

This book should be returned on or before the date last stamped below. An overdue charge of 0.6 nP. will be charged for each day the book is kept overtime.

23 MAR 1992

23 JUN 1995



DELHI UNIVERSITY
LIBRARY



ہوانہ کی روپیں

میرزا بکھش علی قلی

(جلد حقوق محفوظ)

سوانہ کی رو میں

سرزمین مارواڑ کی ایک انتہائی یادگار۔ ذرا اور غناک ٹریڈی

کے پراسرار حانات

یعنی

راٹھوروں کی ہاشمی بانگین! راجپوت کماریوں کی جرات کے کارنامے ان کے حسن و جمال کی رعنائیاں اور رفسین محبت کی دلکش سوکاریاں۔ رزم نریم کی ہوشربا داستان جگرپاش اور جاسم اوقات حسن و عشق کی نوین داستان۔ ایک خفاک از دل دینے والی دلہن و زیچہ کی ایک طراوت گار کے ظلم کو

مرزا عظیم بیگ جٹائی بی بی اے ایل ایل بی (عیلک)

مصلحہ کا پتہ نظامی پک ایجنسی بی بیوں (یو پی)

(مطبوعہ نظامی پریس بیوں)

پیش لفظ

”سوانہ کی رو میں“ چغتائی صاحب کا بے مثل شہ پارہ ہر ستمبر ۱۹۳۵ء میں مل گیا ہے۔
 ملنے جو دھپور گیا تھا جہاں کی نوافض انہوں نے اس طرح کی کپڑے دپڑے کئی مضمون سانی کیلئے
 لکھ ڈالے۔ مجھے روکنے کی انہیں یہ نوکھی ترکیب تھی کہ رات کو کسی کہانی کا پلاٹ سناتے
 اور پھر کہتے کہ ایک دن اور رک جاؤ تو یہ کہانی اور لکھیں۔ غرض میرے ایک ہفتہ کے
 دوران قیام میں انہوں نے دس پارہ نہایت عمدہ افسانے مجھے لکھ کر دیدیے جو میں سر مجھے
 ”چغتائی بزم“ کی اشاعت کا خیال آیا جو چند اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ یکم اکتوبر ۱۹۳۵ء
 کو شائع ہوا۔ ”سوانہ کی رو میں“ چغتائی صاحب کے تخلیقی مضامین کا سب سے اچھا نمونہ ہے
 دوسری بات یہ دیکھنے کی کہ چغتائی صاحب نے بہت طرف نگاہ تھی لیکن چپ ٹریڈنگ
 لکھتے تھے تو اتنی موثر کہ انہیں کہہ سکتے تھے ”سوانہ کی رو میں“ مرزا صاحب کی ”خزن
 نگاری کا شاہکار جو کہانی اتنی دلکش ہے کہ غالباً ان کی کوئی کہانی اتنی دلکش
 نہیں۔ مارواڑ کے رزم و بزم کے واقعات اور ان کی جہان تصویر کشی کے لحاظ
 سے یہ چھوٹی سی کتاب اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور غالباً آخری بھی۔ کہ اب ہرگز
 ار و اتر کو چغتائی جیسا سپوت میسر نہیں آسکتا۔“

شاہ احمد

دلی مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۵ء

زمر بنکار اکھوڑ
راکھوڑی کھانڈے کو نام

صدیوں تک جس نے گورگانی تبتہ کا ہاتھ بٹایا ہے

بصارت خرام و عقیدت
عقیدت کیش

عظیم بیگ چغتائی

”چغتائی مندر“ جو دھپور

۲۴ اگست ۱۹۳۵ء

سوانہ کی رو میں

سوانہ کی پراسرار پہاڑیوں کے خوفناک غاروں اور بلند چوٹیوں کے
 نشیب فرازیں گزرتوگوں کو سفیدیلیاں دکھائی دیتی ہیں جو عموماً کسی
 ناخوشگوار سانحہ کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور وہاں گھومتا ہوا کوئی اگر ان
 کو دیکھ لیتا ہے تو ہم کر بھاگ جاتا ہے۔ مگر دھنیان کی طرف غور سے دیکھتا ہے
 اور اس کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ انکی طرف دیکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ
 جانتا ہی نہیں کہ وہ ان کے پیچھے خود نہیں جانا بلکہ جانے پر مجبور ہی اتفاقاً
 میں نے بھی ایسی ہی ایک جگہ دیکھی لیکن صر رسیا ہو دے اور بڑے دیرینہ گزشتہ
 سنوں اور بہت سے چھوٹے :-

لے براست جو دھپور کا مشہور نصیب جس کی گچھاؤں میں درگاہیں اٹھو رنے اور نگہ زیب
 بے پوند ہوتی کو چھایا دیا تھا اور چودہ برس تک وہیں پرورش کی ۔

زُٹ رنکار اکھوڑ
راکھوڑی کھانڈے کو نام

صدیوں تک جس نے گورگانی تبتہ کا ہاتھ بٹایا ہے

بصیرت خرام و عقیدت
عقیدت کیش

عظیم بیگ چغتائی

”چغتائی مندرل“ جو دھپور

۲۴ اگست ۱۹۳۵ء

سوانہ کی رو میں

سوانہ کی پراسرار پہاڑیوں کے خوفناک غاروں اور بلند چوٹیوں کے
 نشیب و فراز میں کئی کئی لوگوں کو سفید پتیاں دکھائی دیتی ہیں جو عموماً کسی
 ناخوشگوار سانحہ کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور وہاں گھومتا ہوا کوئی اگر ان
 کو دیکھ لیتا ہے تو ہم کو بھاگ جاتا ہے۔ مگر انہی ان کی طرف غور سے دیکھا کر
 اور اس کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ان کی طرف دیکھنا خطرے کی گالی نہیں ہوتا۔ وہ
 جانتا بھی نہیں کہ وہ ان کے عجیب و غریب جانا بلکہ جانے پر مجبور ہو جاتا
 ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی ایک بلی دیکھی لیکن اسے رسیاہ بودیلے کے بچہ کی نشت
 سے اور بہت سے چھوٹے :-

۱۔ ریاست جو دھپور کا مشہور تھیں جس کی گھٹاؤں میں درگاہیں اٹھوڑنے اور ننگے پتے
 کے پوتہ پوتی کو چھپا دیا تھا اور جو وہ برسن تک وہیں پرورش کی ۔

— (۱) —

ای جینے کی ۹ تاریخ کا ذکر ہے کہ میں ایک کام سے سوانہ گیا۔ کام سحر فراغت حاصل کر کے سوانہ کے مشہور قلعہ کی طرف گیا۔ قلعہ کی پشت کی طرف پہاڑی کے ۲ امن میں دوڑ تک چلا گیا۔ سرخ رنگ کی خاموش اور بہیت ناک چٹانوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہے جو دوڑ تک چلا گیا ہوا اور قلعہ کے ارد گرد میلون ٹکنے مانہ اضی کی فوجی اور شاہی عمارتوں کے کھنڈر چلے گئے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علاؤ الدین خلجی کی فوجیں راجپوتوں سے بحرائی تھپیس اور یہاں قلعہ کے اس پاس نہ معلوم کس کس زمانہ میں کیسے کیسے قلعہ اور محل تھے۔

یہ پہاڑیاں بھی عجیب و غریب ہیں۔ ان کی عجیب و غریب اور پتینا اور تہار یک سُرخیوں اور گچھاؤں کے طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ وسیع دہانہ کی ایک سُرنگ میں آپ اگر داخل ہوں تو دو تین فرلانگ تک سیڑھے چلے جائیے پھر کہیں ایک عظیم الشان ہال ملے گا جس کو قدرت کے ہاتھوں نے پہاڑی کے اندر ہی کاٹ کر بنایا ہے اور رستہ قہر کے رہنے والوں نے اپنے بھتہ داروں سے اس ہال کو اپنی رہائش کیلئے ٹھیک کیا ہے۔ کسی کچی ہوئی چٹان کو تراش کر تخت کا کام لیا ہے تو دیوار کے کسی گڑھے کو برابر کر کے الماری یا طاق کا کام لیا ہے۔ اب ہال میں دیکھئے

تو چار پانچ سڑگوں کے دہانے ہیں جو علحدہ علحدہ سمت میں چلے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں جایئے آئے چل کر آپ کو بھر طرح طرح کے ہال یا کمرے اسی طرح کے ملیں گے۔ ان میں سے بعض میں آپ دیکھیں گے کہ حوض بنا ہے جو پانی سے لبریز ہے۔ یہ پانی اپنے قدیم رستے سے بارش کے زمانے میں پہاڑ کی چوٹی سے رس کر آتا ہے پانی زیادہ ہو تو حوض بہہ نکلتا ہے۔ پور بارش زمانہ پانی خشک ہو جاتا ہے پھر اس ہال میں سے بھی ادھر ادھر راتے چلیں گے۔ کوئی راستہ کسی تاریک اور خوفناک کھڑپ میں جا کر ختم ہو گیا اور کوئی راستہ اس قدر چھوٹا ہو گیا ہے کہ اس میں سے جانے کی ہمت نہیں پڑتی لیکن بہت سے راستے ایسے ہیں کہ ان میں گھوڑا دوڑائے چلے جلیئے۔ اور بعض جگہ پہاڑی کے مشرق سے داخل ہو کر مغرب کی طرف چل جلیئے۔ یہ تمام سڑگیں قدرتی ہیں۔ صرف کہیں کہیں انسان کے کاریگر ہاتھ نے ان کو درست کر لیا تھا۔ میں ہلتا ہلتا دوڑ تک چلا گیا۔ کوئی دو میل پہنچا کہ مجھے عمارت کا ٹوٹا ہوا حصہ ملنے ہی پر نظر پڑا۔ ایسا کہ میرا جی چاہا کہ دیکھوں تو کہ اس شکستہ دیوار کے اُس طرف کیا ہے۔

بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں میں ہوتا ہوا ہیں اوپر چلا گیا۔ کوئی ادھی دو رگیا ہونیکا کہ ایک عجیب و غریب معاملہ پیش آیا۔ ایسا کہ میں عمر بھر

کبھی نہیں بھولوں گا۔

نہین نہین نہین

جاتے ہیں اپنے ہاتھ کو ایک طرف ایک تھوڑے کا سخت جان و رخت تھا۔
 اُس کے پاس ہی ایک سفید رنگ کی پٹی کھڑی تھی اور جیسے ہی میں پہنچا ہوں کہ وہ
 بولی میں نے معاً اس کی طرف دیکھا کہ ایسی پٹی بھلا یہاں کہاں سے آئی میرا دیکھنا
 تھا کہ وہ آہستہ سے سر کر چلی۔ نہ معلوم کیوں میں بھی اُس طرف بڑھا یہ دیکھنے کو کہ
 کدھر جاتی ہے۔ ایک چٹان کا ستون کا ستون کھڑا تھا جس میں کوئی دو فٹ کی کنگر
 نعلی ہوئی تھی۔ پٹی اس پر گئی۔ پاس ہی تھا لہذا میں بھی اُس کنگر پر پہنچ کر دوسری طرف
 گھوم کر کھانا تو شکستہ چٹانوں کی ایک تنگ گلی سی پٹی جو آگے ہی جا کر ختم ہوتی معلوم ہوئی۔
 جی اس میں کئی آدمی بھی دس قدم بڑھا ہوں گا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ پٹی ایک چھوٹے
 سے غار میں گھس گئی۔ سامنے ہی غار تھا اور میں نے جو آگے بڑھ کر اُس میں جھانک
 کر دیکھا ہے تو۔ الامان!

تاہم میں ایک جنبش سی نظر آئی اور ایک انتہا سے زیادہ ضعیف آواز
 تاہم یہی کے خوفناک پردوں سے لرزتی سی گئی۔ ایسی کہ میرے بدن کے رونگٹے

کھڑے ہو گئے ”جے شری ماتاری“ راجپوتی سلام تھا۔ یہاں عادت ہے کہ راجپوتوں سے بسا اوقات یہ بھی سلام ہو جاتا ہے۔ میری زبان سے بھی جواب نکلا ”جے شری ماتاری“ اور غور سے دیکھتا ہوں تو ایک عجیب و غریب سنی اس مختصر غار میں دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھی تھی۔

گندمی رنگ کا برہنہ بدن جو سب کا سب سفید رنگ کے میلے جھاڑ جھنڈ کاڑ سے بالوں میں الجھا سا پڑا تھا چہرہ کا پتہ لگنا مشکل۔ بالوں کی الجھی ہوئی لٹوں کے درمیان سے دو آنکھیں چمک رہی تھیں جن میں سے ایک کا آدھا حصہ بھینور اور سر کے پریشان بالوں سے چھپا ہوا تھا۔

میں غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اپنا لکڑی کی طرح خشک اور سُکھا ہوا مُردہ ہاتھ اٹھایا اور مجھے آنے کو اشارہ کیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کوئی عبادت گزار سا دھوپ ہے اور بہتر ہے اس کی قدرِ مبوسیٰ حاصل کی جائے۔ اور بُلاتا بھی ہے۔ لہٰذا میں جھک کر غار میں داخل ہوا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر جس طرح مارواڑی بزرگوں کو سلام کیا جاتا ہے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ اُس نے محبت سے سر کو جنبش دی اور قریب بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے غور سے اس

سادھو کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ میں دراصل اس کے
 بالوں کو دیکھ کر حیرت میں تھا ایک جنگل تھا کہ سر سے جُباؤں کی جُباؤں لٹکی ہوئی
 دُور تک زمین پر پھیلی ہوئی تھیں اور اُن کو سینٹ کردہ اُن سے ستر پوشی کا
 کام بھی لے سکتا تھا۔

سادھو نے صاف بیہر تیار پہچیں مار و اڑی میں مجھ سے باتیں شروع
 کیں اور میرے لئے حیرت و استعجاب کا باب کھول دیا اُس نے مجھ سے کہا:-
 ”میں تمہارا جی منوں ہوں گا اگر تم ایک لاش کا گریا کریم کرنے میں مایوس
 دے سکو“

میں نے گھبرا کر کہا کس کی لاش؟
 ”ایک غم نصیب سہتی بٹی“

میں نے سادھو کی طرف دیکھا۔ دراصل میں کسی طرح بھی کسی لاش سے
 سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بجائے ہاں ہوں کرنے کے میں نے کہا:-

”آپ یہاں اکیلے ہیں؟“

”ہاں میں اکیلا ہوں“

”کب سے؟“

سو کھٹے منہ سے بڑھے نے کہا: ”نبیّتِ دین ہوئے۔ اب کون سمت ہے؟“
یہ سمر ۱۸۱۵ کا ذکر ہے جب میں یہاں آیا تھا۔“

دوسرے ۱۸۱۵ میں نے جو اس باختہ ہو کر کہا۔ اور یہ سمجھا کہ ضرور اس کی عقل خراب ہو گئی ہے۔ ”سمر ۱۸۱۵ میں آپ یہاں آئے تھے اپونے دوسو برس پہلے! اب تو سمر ۱۹۹۲ ہے۔“

سادھو نے کہا ”ہاں سمت ۱۸۱۵ کی چیت باری چھٹ کو میں نے یہاں آسن جایا تھا میرا جنم سمر ۱۷۹۱ کا ہے اور اُس وقت میں تیس برس کا ہوں گا۔“

میں بھاگنے کی تہیہ اپنے دل میں اٹھا رہا تھا میں نے پھر ہی سوال کیا۔
”آپ کون ہیں؟“

”میں سادھو ہوں اب تو۔“

”اب تو.....“

ہاں اب تو سادھو ہوں پہلے کچھ اور تھا جوانی میں۔“

”کیا تھے؟“

”سپاہی۔“

”پھر سادھو کیسے ہو گئے؟“

سادھو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ایسی کہ اُس کی سب کی سب پسلیاں چکنے لگیں اور اُس نے مجھ سے کہا :-

”کہا کرو گے پوچھ گئے؟ مگر انہیں بہتر ہے کہ میں تمہیں بتا دوں بلکہ شاید ضروری ہے مگر یہ بتاؤ تمہیں تھوڑی بہت اس وقت فرصت ہو؟“
میں نے کہا: ”ہمارا راج آپ ضرور سُنا ہے۔ اور یہ بھی بتائیے کہ اب تک آپ زندہ کیسے ہیں؟“

سادھو نے متعجب ہو کر کہا: ”زندہ؟ زندہ ہوں میں! اوہو اب تم ذرا اطمینان سے بیٹھو اور سنو۔ سب معلوم ہو جائے گا کہ میں اب تک کیسے زندہ ہوں۔“ سادھو نے اپنا قصہ صاف مارواری میسر تیر لہجہ میں شروع کیا۔ جس کا مطالبہ یا ترجمہ حسب ذیل ہر جو پیش کرتا ہوں۔

بانی تشری جاڑی پچی جی

میرا نام میٹرنیا امر سنگھ ہے۔ میرا باپ راکھو جی سوچت کے قلعہ رار دیپ سنگھ جاڑی پچہ کی نوکری میں تھا۔ دیپ سنگھ کی اور میرے باپ کی پُرائی دوستی تھی بلکہ بھائی چارہ تھا اور دونوں بچہ وی بال بھائی تھے۔ میرا باپ غریب تھا۔ دیپ سنگھ جاگیر دار اور قلعہ رار تھا۔

سوچت کے قلعہ کے پشت کی پہاڑیوں میں ایک بلند چوٹی پر دیپ سنگھ کا محل ہے۔ دیپ سنگھ کے سوچی پچے اس محل میں رہتے تھے۔ محل بنی ایک اچھا خاصہ قلعہ ہے۔ تمام نے نہ دیکھا ہو گا۔

میں نے کہا ہارات سوچت کا عظیم انسان قلعہ گریہ میں مل گیا۔ میں سوچت لے جاڑی پچہ راجپوتوں کی مشہور ذات ہے۔ ہر جاڑی پچہ کی ترکی جاڑی پچی جی کہلاتی ہے۔ مشہور کرکٹ کھلاڑی رنجی نادان مگر کے زجہ جاڑی پچہ تھے۔

۱۳ ریاست جودھپور کا حصہ ہے۔ جونی سیائی ریلوے پر سوچت روڈ کا اسٹیشن ہے۔ قلعہ میں ذکر ہے اجیر والی شکر کے کنا سے ہی ہے۔

میں بہت رہا ہوں اور قلعہ میں کھیتی ہوتی ہے، مٹلوں اور کھنڈروں میں گیڑوں کا شہر آباد ہے، اس کی پشت پر بھی مجھے تو کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں۔ باں قلعہ کے قریب شری جو انڈیا جی کا استھان البتہ قائم ہے۔“

سادھو نے شری جو انڈیا جی کے نام پر دونوں ہاتھ جوڑ کر احترام کی گھٹائے

اور پھر مجھ سے پوچھا:-

”تم نے ان کے درشن کئے ہیں۔“

میں نے کہا:- ”جی ہاں میں تو صبح کو دوسرے تیسرے روز جاتا تھا، ادھر

تب درشن بھی کرتا تھا۔“

سادھو نے کہا:- ”افسوس ہے نام مالک۔ ہاں اسی محل کا ذکر کر رہا ہوں

جس کو تم بتاتے ہو کہ ضلع ہستی سے مٹ گیا میں اسی محل میں بڑھا اور پلا اور جوان

ہوا ہوں جس کے خوفزدہ کھنڈروں کو دیکھ کر تم وحشت زدہ ہو گئے ہو ذرا

مجھے تفصیل کے ساتھ بتاؤ کہ اُس گہوارہ عشرت کا اب کیا حال ہے۔“

میں نے تفصیل کے ساتھ سوچتے قلعہ اور اس کے گرد و نواح کے تمام

لے رہا ٹھوروں کی خاص خانہ دانی دی۔

کھنڈروں کا سا راحال بتایا جس کی تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔
 اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اُس نے میری آنکھوں کے سامنے محلوں کی تصویریں
 دی اور میں نے اس حلقی تصویر کو بگاڑ کر موجودہ کھنڈروں کی تصویر پیش کر دی
 جہاں تک عبرت کا سوال ہے، ہم دونوں نے عبرت حاصل کی۔ اُس نے کم میں نے
 زیادہ۔ اس کے جملہ معترضہ کے بعد۔ میں پھر سادھو کے قصہ کو لیتا ہوں۔
 سادھو نے اپنا قصہ پھر سہہ نہ کیا :-

”.....“ دیپ سنگھ جی رات کو سو جت کے قلعہ میں رہتے تھے اور
 صرف دن کو اپنے محل میں تھوڑی دیر کے لئے آتے تھے۔

دیپ سنگھ کی ٹھکانہ پانی پور میں تھی۔ میں نے سو جت ہی میں ہوش سنبھالا
 میرے پتاجی محل کی ڈیوڑھی کے سردار اور محل کے مختار کل تھے۔ ٹھکانہ دیپ سنگھ
 کے سوائے ایک لڑکی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس لڑکی کا نام پھول کنور تھا اور
 محل میں سب اُس کو ”شری بانی جی“ بھی کہتے تھے۔ میں بھی چونکہ ایک نوکر کا لڑکا تھا
 لہذا میں بھی اُن کو بانی جی کہتا تھا۔

لے راجپوتوں کی تو م ہاڈا۔

بائی شری جاریجی چھوٹی عمر سے میرے ساتھ ہی کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کو گھوڑے کی سواری سے بہت شوق تھا اور محل میں ان کے لئے گھوڑے دوڑانے کا میرا ان بنوادیا گیا۔ ابھی دس بارہ برس ہی کی عمر تھی کہ نو عمر بائی شری جاریجی جی سچا ہیموں کی طرح نیزہ بازی کرنے لگیں۔

بائی جی عمر میں مجھ سے چھ یا سات سال چھوٹی تھیں۔ جب وہ بارہ برس کی ہوئیں تو میں اٹھارہ برس کا ہوا اور اب میں ان کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا اب خا۔ اکی شان کہنے یا بسمتی ہی وہ زمانہ تھا کہ نو عمر بائی جی میرے خیالوں میں پس کر رہ گئی بھلا غور تو کیجئے کہ کہاں ایک معزز ٹھاکر کی خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی اور کہاں ہیں۔

بائی جی بڑے پردہ نہیں کرتی تھیں علاوہ اس کے یہ بھی میں جانتا تھا کہ وہ میرا خاص خیال کرتی تھیں مجھے سب لوگ امر کہتے تھے اور بائی جی کبھی پکارتی تو امر جی کہہ کر پکارتیں۔ یہ ان کو بدنیہ نہایت ہی ادب سے جھک کر دونوں ہاتھوں سے تنظیم دیتا تھا اور میں دیکھتا تھا کہ وہ میرے موڈ بانہ دستور کو پسند کرتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا اور بائی جی کی دلکش تصویر کا نقش میرے دل پر اور بھی

گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ سچ مخ دہ سنکھوں اور ولی میں بس گئیں بجز ان کو مطلق علم نہ ہو سکا کہ میر ان کے عشق میں مبتلا ہوں۔

(۲) سنت

بائی جی کو تیر نے کابھی بہت شوق تھا چنانچہ اجی کے درشن کو تو اکثر جاتی تھیں لیکن کبھی کبھی چوانڈا جی کے استھان کے نیچے جو پختہ جھیل ہے اس میں شان بھی کرتی تھیں۔ چاروں طرف پہرہ لگا دیا جاتا تھا اور محفل کی دوا چارو تیں اور ڈاؤڑ مہیاں (خو جیس) ساتھ ہوتی تھیں۔ اس موقع پر بائی جی اپنے تیر نے کے شوق کو پورا کرتی تھیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ صبح کوئی دو گھنٹہ دن دھلا ہو گا کہ سو جت نے قلعہ محفل کی طرف روانہ ہوا۔ خیال آیا کہ لاؤ چوانڈا جی کے درشن کرتا چلوں اپنا پہاڑی پر سے جو راستہ چوانڈا جی کو جاتا تھا اس کی طرف چلا۔ اصل راستہ ایک موٹا مٹی کا تھا جھیل کی طرف سے جہر لیکن میں نے یہ سوچا کہ جہر کا ٹکڑا اُدھر کون جائے۔ لاؤ اسی طرف سے پہاڑی پر چڑھ جاؤں۔ چنانچہ تم نے بچھا ہو گا ستہ نہ صرف اہوار ہے بلکہ بعض جگہ بہت دشوار گزار ہے۔ لیکن میں جو ان تھا پھر سے میں چڑھتا چلا گیا۔ استھان پر پہنچ کر میں نے چوانڈا جی کے درشن کے اور واپس

اصلی راستے سے جانے لگا تو مجھے ایک چارن روکا اور کہا کہ اُدھرت جاؤ۔
 بانی جی اُستنان کر رہی ہیں اور پہرہ لگا ہوا ہے۔ تم کدھر سے چڑھ آئے ہو؟ اس کے
 منہ سے یہ لفظ نکل ادا ہوئے تھے کہ ہیل کی طرف سے عورتوں کے چنے جتانے کا
 شور برپا ہوا۔ بانی شری جا ایچی جی ڈوب رہی تھیں اور تمام عورتیں چیخ رہی تھیں۔
 ”بانی جی ڈوبے ہے۔ بانی جی ڈوبے ہے“ کسی کے ڈوبنے کی خبر سن کر ایسے ہی
 ہوش خطا ہو جاتے ہیں اور بالخصوص میرے لئے یہ خبر بیجا م موت سے باز تھی۔
 ہنایا یہ جو اس ہو کر ہیں راستے کی طرف دوڑا مگر تھوڑی ہی دور جانے پایا تھا
 کہ مجھے پھر سے کسے سپاہی نے روک دیا اور باوجود میری کوشش کے اُس
 نے جانے نہ دیا۔ مجبوراً میں پھر ملٹا اور اوپر آکر استھان کا دیوار پر چڑھ گیا
 اور دیوار سے کود پڑا۔ دیوار جا رہا پانچ گز اونچی تھی۔ اور یہاں سے باطل نامہوار
 ڈھال پر سے پتھروں میں سے جوتا ہوا سانے چٹان پر پہنچا اور یہاں سے
 جو نظارہ ہیں نے دیکھا اُس نے مجھے پاگل کر دیا۔ بانی جی واقعی ڈوب رہی تھی
 اور کنارے کی عورتوں کی رسائی سے بہت دور تھی میں دیوار وار اس چٹان
 پر سے اُنکے برہہ کر نیچے والی چٹان پر پہنچا۔ یہاں تم نے دیکھا ہو گا دُور تک
 کھلا ہوا راستہ چلا گیا ہے۔ پہاڑی کے سہاگے سہاگے اس راستے پر میں دوڑا

چلا گیا اور تیزی سے اس لگہر پر سو پونچ گیا جو ایسی تھی کہ جس پر سے گود کر میں
 جھیل میں گر سکتا تھا۔ چنانچہ عورتوں کے بے ہنگام شور و غل میں ہمت کر کے
 میں نے ایک جت لگائی اور کوئی پچیس گز کی بلندی پر سے سبھا جھیل میں
 کود پڑا۔ گرنے کے زور میں نیچے مک ڈو پٹا چلا گیا لیکن پھر مجھے پانی نے اوپر بھینکا تو
 میں نے دیکھا کہ فاصلہ پر بائی جی پانی سے آخری زور آزمائی کر رہی ہیں اور ماہد
 کے لئے چیخ رہی ہیں۔ میرے جھیل میں گرنے سے عورتوں کا شور و غل ایک دم سے
 بنایا ہو گیا تھا اور میں نے وہیں سے آواز دی۔ ”بائی جی گھبرا مت یہ تاناہوں“
 اور یہ کہتے ہوئے جس قدر بھی مجھ سے تیزی سے ہو سکا پانی کو جیر تاناہو بائی جی
 کے پاس پہنچا۔ بائی جی کا بُرا حال تھا اور اُن پر سخت وحشت طاری تھی میرے
 پہنچنے ہی وہ مجھ سے بُری طرح چٹ گئیں۔ ایسی کہ مجھے بڑا الحاح معلوم دیا کیونکہ
 اُن کا لباس ضرورت سے زیادہ غیر سادہ تھا۔ میں نے بائی جی کو بائیں ہاتھ سے
 اپنی گود میں بٹھالا اور انہوں نے میری گردن میں چمٹ کر اپنا ہاتھ حاکم کر دیا۔
 اور ایک ہاتھ اور پاؤں سے میں پانی کاٹ کر کنارے پر پہنچا اور بائی جی کو اُنکی
 ڈاؤنڈھیوں کے سپرد کر کے جھیل میں پانی آنے کی نچتہ موریوں میں سے گھس گیا اور
 باکر قلعہ کی موریوں کے پاس نکلا۔ یہاں پہونچکر میں نے اپنے کپڑے بچوڑے

اور محل میں چلا آیا۔ بانی جی کو جس وقت میں پانی میں سے خیر تا ہوا لایا تھا اُس وقت میں نے اُن کے ساتھ ایک گُستاخی بھی کی تھی یعنی اُن کے رُخا کو چوم لیا تھا۔ یہ خطاب مجھ سے ایک ایسے ہی کے عالم میں سرزد ہو گئی تھی۔ لیکن بانی جی نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ مبرا بھی نہ مانیں بلکہ شرمناک اپنا رُخسار میری گردن میں پھپھایا۔ لیکن رفتاً مجھے احساس ہوا تو میں نے لجاجت کے ساتھ اُن سے معافی مانگی اور کہا: ”اگر آپ کو بُرا معلوم ہوا ہو اور آپ اس گُستاخی کو معاف نہ کر سکتی ہیں تو میں بہتر سمجھوں گا کہ آپ کو کُنا سے پرہیز کر بطور رمز اسی پانی میں ڈوب مروں“۔ بانی جی نے مُنہ سے تو اس کا جواب کُچھ نہ دیا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اُنکی آنکھوں نے نہ صرف مجھ سے یہ کہہ دیا کہ ایک سرے سے اولیٰ تو یہ کوئی خطا ہی نہ تھی اور تھی بھی تو میری نہ کہ تیری! اور جب میں نے او نہیں کُنا سے پرہیز کیا ہے تو پھر اُن کی آنکھوں نے اسی بات کی دوبارہ تصدیق کی اور وہ بھی اس پیرائے میں کہ مجھے معلوم ہوا کہ خطا کا سوال ہی نہ تھا۔

قصہ کو اس طرح مختصر کرتا ہوں کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خیر نہ ہوئی
ایہ مَظہین یعنی میں اور بانی جی ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے۔

میں چونکہ محل ہی میں رہتا تھا اور مجھ سے پرہیز بھی نہ تھا لہذا عشق کی کہانیاں اور بھی جلاہ مرتب ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ کہ بائی جی خود میری محبت میں چور ہو کر رہ گئیں عورت کی محبت نہ صرف ایک دولت ہے بلکہ ایک ایسی نعمت ہے اور ایک ایسی پرسوں چیز ہے جو ان کی نہ صرف رنگینی بلکہ زبردست قوت کا احساس آدمی کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ مگر یہاں یہ حال تھا کہ میں ایک دینی نچا کر اور وہ ایک زبردست قلعہ دار اور جاگیر دار کی جیبتی بیٹی۔ چنانچہ ان امور کو نظر رکھتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ ضرور کسی نہ کسی دن یہ رنگین محبت بُرے دن دکھائی

جائے۔ قلندر کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کا نام دلاور سنگھ تھا۔ یہ ایک بُرا بچہ اور شیر دل جوان تھا۔ عموماً لوگ اس کو 'دل جی' کو بناؤتے نام سے پکارتے تھے۔ جب شیر بائی جی کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوئی۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ میں ان کی اور وہ میری محبت میں فنا ہو رہے تھے کہ بائی جی کے والد بیمار پڑ گئے۔ بچنے کی جب کوئی آس نہ رہی تو انھوں نے یہ وصیت کی کہ میرا

لہ جو دھپور کا قلعہ اور قلعہ نہایت حکمرانی پرانے علاؤ الدین خلجی نے زور زمامی کی تھی۔
 علاؤ الدین خلجی جو کہ نہایت حکمرانی پرانے علاؤ الدین خلجی نے زور زمامی کی تھی۔

قلعہ یعنی محلِ رخِ آسِ پاس کی زمین کے دلِ جی کو نبادت کو دیدیا جائے اور میری لڑکی بھی اسی کو بیاہ دی جائے۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے دلِ جی کے باپ کو ایک خط بھی لکھ دیا جو ان کا بڑا دوست تھا۔ بائی جی کے والد کا وصیت کے پتہ پر وہ دن کے اندر ہی انہارا انتقال ہو گیا۔ ان کے صرف ایک ہی ٹھکرا انی ہاؤس جی تھیں جو ان کی جیسا میں بڑھ کر سستی ہو گئیں۔ اب صرف بائی جی رہ گئیں اور جالورہ لوگوں نے ان کو قلعہ کی کھیاں اپنی تحویل میں لے لیں اور بے سوختہ قسم ہونے کے جاوڑہ الوں نے شری بائی جی سے شادی کی تہیہ اٹھائی۔

میرے لے یہ وقت اتنا سے زیادہ سخت تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں چپکے سے رات کے وقت ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں بائی جی مجھے اکیلے لگ گئیں۔ اور میں نے حالِ دل اسٹا کر فریاد کی تو انہوں نے کہا کہ ”میں عورت ہوں تم مرد ہو بہ نسبت تمہارے ہیں زیادہ محبوب ہوں“ میں یہ سن کر اور ان کو اپنی محبت میں متزلزل سمجھ کر واپس چلا آیا۔ لیکن نہیں میرا خیال غلط تھا و سرے ہی دن محل میں ایک تہلکہ سا ہوا ہو گیا۔ یہ واقعہ تھا کہ بائی جی نے کو نبادت سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس قصے نے ایسا طول کھینچا کہ سارا محل زیر و زبر ہو گیا۔ بائی جی کا کہنا تھا کہ ”میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں تو پشکر کے مال پر جا کر نفوی

ے یوں گی۔“ لاکھ عورتوں نے سمجھایا، بچھایا مگر وہ نہ مانی اور اس دوران میں کو بناؤتوں نے جو یہ خبر سنی تو جاتوڑے ایک دستہ بیکہ سیدھے محل کی طرف دوڑ پڑے اور قلعہ کے ہر شعبہ اور محکمہ پر قبضہ کر کے باقی جی کے رنگ محل کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا۔ مطالب یہ کہ یوں راضی خوشی نہیں تو زبردستی شادی کر لیں گے۔ چنانچہ خود نو جوان کو بناؤت بھی آگیا۔ اور باہر اس نے ڈیرے والدیئے اور اس کے بعد کو بناؤتوں نے محل کی تمام بار سونچ عورتوں کو اپنی طرف ملا کر باقی پر جائز و ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو اپنے باپ کی وصیت پر عمل کی ترغیب دلائی شروع کی۔ مجھے کو بناؤتوں سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ علاوہ رقیب نے کئے کو بناؤت نے سب سے پہلے میرے باپ ہی کو نکالا تھا چنانچہ میرے والد کو کا دل چلے گئے، لیکن میں نہ گیا اور جا بھی کیے۔ سکتا تھا بڑی سخت کشمکش اور رد و قدح کے بعد باقی جی کو چھ ماہ کی مہارت ملی تھی کہ اس دوران میں جو کچھ بھی سوچ بچار کرنا ہے سوچ سمجھ لیں۔ اور اس مہلت ملنے کے بعد ہی سوچت چھوڑ کر میں اپنے گاؤں آیا تھا اور اس فکر میں تھا کہ یا مدد و ستون کو جمع کر کے کسی طرح سوچت لے چلوں اور جس طرح بن پڑے باقی جی کو نکال لاؤں۔ لیکن مجھے گھر آئے ہوئے کوئی مین پچیس دن ہوئے ہوں گے کہ میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔

”کیا دیکھتا ہوں کہ بانی شری جاڑی جی سولہ سنگار کئے یاں بائی تہی پڑے
 حُسن و عشق کی مجسم تصویر برنگ۔ محل کی سرھٹھیوں پر کھڑی ہیں۔ اور دایہ بائیں
 کان کے سامنے۔ اچھلی اٹھی ہوئی، مشعل کی طرح جل رہی ہے جس کی تیز روشنی کا نور
 اُن کے سُرخ و سفید چہرے پر ایک عجیب انداز سے پڑاؤ لگن ہے۔ ایسا کہ میں ان کے
 حُسنِ لافانی کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہوں مگر فوراً ہی جھٹک کر سلام کرتا ہوں
 اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پوچھتا ہوں کہ ”بانی جی مشعل.....“
 ایک دم سے اُن کے حسین چہرے پر دلربا لرزش سی ہوتی ہے اور مکر کر
 کہتی ہیں ”امراجی یہ تمہاری محبت کی آگ ہے“
 میرے مُنہ سے ایک دم سے ایک لہرِ ذریعہ نکلی اور میں سوتے سے جاگ پڑا،
 ایسا گھبراہٹ اسی دن سوچت کی راہ لی۔ بانی جی نے سچ مجھے بتایا کر دیا۔
 جب میں سوچت پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوئٹہ دو توں نے قلعہ میں اپنی فوج کو گنتی
 کر دی ہے اور محل کے چہرے پر پورا قبضہ ہے چنانچہ جی میں وہاں گیا تو مجھے
 محل میں کسی نے گھسنے بھی نہ دیا۔ مجھ کو اُمیں نے سوچت میں قیام کیا۔
 محل کے خاص خاص لوگوں اور رازداروں سے ملا تو معلوم ہوا کہ کوئٹہ
 اور بانی جی کے درمیان بانی جی کی ایک رشتہ کی دادی پڑی ہے اور انہوں نے

بانی جی کو راضی کر لیا ہو۔ چنانچہ بہت جلد کو بناؤت کی شادی بانی جی کو ہو جائیگی۔ میرے لئے یہ خبر ناقابل برداشت تھی اور اب میرے یہ سوچا کہ جان کھیل جاؤں میں نے خود کو بناؤت سے ملنے کا ارادہ کیا مگر میں چاہتا تھا کہ کسی ایسی جگہ ملو جو یہاں کے تاثرات سے لوث نہ ہو۔ چنانچہ ایسا موقع بنا۔ رہ دن کے انا رہی اندر بل گیا۔ کو بناؤت کو کسی ضرورت سے جا لور جانا پڑا اور جب لور میں مجھے موقع ملا کہ میں کو بناؤت سے تنہائی میں بات چیت کر سکوں۔

ایک درخت کے نیچے ہم دونوں کھڑے تھے۔ کو بناؤت اپنے گھوڑے کی بال ڈو پکڑے کھڑا تھا اور ہم دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں میرا خیال تھا کو بناؤت کو میرے اور بانی جی کے عشق و محبت کا علم نہ ہو گا لیکن یہ خیال غلط تھا کیوں کہ ملاقات ہوتے ہی پہلی بات جو کو بناؤت نے مجھ سے کہی یہ یہ تھی :-

”تم انھی سے گنا لینا چاہتے ہو؟ نتیجہ معلوم ہے؟“

میں نے کہا ”آپ بڑے جاگیردار کے کنواریں۔ آپ کو قلعہ چاہئے ہو قلعہ چاہئے ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ کو جاگیر کچی نہیں چاہئے۔ آپ تو قلعہ کی لالچ میں بانی جی کو چاہتے ہیں۔ میں چھوٹا آدمی ہوں اور بہتر ہے کہ آپ کوئی اونچا گھر دیکھیں کیا آپ کے سے بانٹنے کو بناؤت کے لئے؟“

پیسے کے زور سے اور حائیتوں کی تعداد کے زور سے جاری ہو چکی کو جیتنا چاہتے ہیں۔
کو بناؤت کا نو جوان چہرہ غصہ سے تہمتا اٹھا اور اُس نے عقارت آمیز لہجہ
میں تجھے جھڑک کر کہا: ”یا اہل غلط ہنہ“

میں نے کہا: ”پھر آؤ تم تم لو ار سے فیصلہ کر لیں۔“
کو بناؤت نے جواب دیا: ”مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ تمہارے ایسے
رہا میوں سے لڑتا پھریں۔“

میں نے حل کر کہا: ”کنو ر صاحب! اچھی طرح سمجھ لیجئے اگر اچھا ہے میں کہ جاؤں گی
آپ کی ہو جائے تو مجھ سے جیتنا پڑے گی۔ اگر مجھ سے مقابلہ کی ہمت نہ ہو تو
بہتر ہے کہ اس کا خیال دل سے کمال دیجئے۔“

کو بناؤت بولامیری تلوار غالباً تم جلیوں سے بہتر لوگوں کے خون پینے
کے لئے بنی ہو۔ لہذا بہتر ہے کہ تم یہاں سے دور ہو میں فضول گوئی نہیں چاہتا! اور
باد رکھو! اگر کہیں میں نے تمہیں وہاں آس پاس دیکھ لیا تو تمہارا سرتن سے مجھ پر
نظر آئے گا۔“

آخری لفظ کو بناؤت کے منہ سے ادا ہوا ہے میں کہ اُس نے اپنے سامنے میری
پشت کی طرف اس طرح دیکھا کہ مجھے شہ ہوا کہ میرے پیچھے سے کوئی آتا ہے جسے اس

نے دیکھا ہے۔ سامنے کچھ فاصلہ پر کو بناوت کے دو آدمی کھڑے تھے اور دوسرے
 نظر ڈالی تو وہ غائب۔ لہذا کو بناوت کی نظر میری پشت پر پڑی تو کہ میں نے بھی مڑ کر
 دیکھا میرا دیکھنا تھا کہ ایک دم سے کو بناوت کے وہی دونوں آدمی میرے دہشتگی
 تلواریں لے کر چھپٹ پڑے۔ اور کو بناوت نے کہا: "یہ سنا" مگر قبل اس کے کہ میرے اوپر
 حملہ ہو میں اٹھل چکا تھا اور میری ڈھال میرے بائیں ہاتھ میں تھی، اور دوسری دایں
 ہاتھ میں۔ دونوں نے ایک چھپٹ کے ساتھ میرے اوپر وار کئے۔ ایک کے وار
 کو میں نے ڈھال پر لیا اور دوسرے کے وار کو مجھے جب وار اپنی تلوار سے روکنا پڑا۔
 یہ دونوں وہی زعلیم کون ذات تھے مگر راجپوت نہیں تھے قبل کرنا چلتے ہوئے
 مگر لڑنا نہیں جانتے تھے جتنا تجربہ میں نے جنم زدن میں ایک کلیر کاٹ دیا اور دوسرا
 ازخود دھاک نکلا۔ اب میں کو بنات کی طرف لپکا لیکن کو بنات کھوٹے پر سوار چکا
 تھا اور اس کے ہاتھ میں برچھا تھا۔ ایک دم سے اُس نے میرے اوپر گھوڑا ریل دیا۔
 میں نے شکل اپنے کو بچا یا اور نہ اُس نے نیزے میں پرو لیا تو اب میں نے سر وہی کا ہاتھ
 ترچھا لگا کر نیزہ روکا۔ کو بناوت قہقہہ لگتا نکل چلا گیا۔ غائب ہو جاتا تھا کہ
 مجھ سے مقابلہ آسان نہیں ہے اُس کا ساتھی دوزخ میں میرے پیچھے پیچھا آئے مگر
 قریب نہ آیا جس قدر جلد مجھ سے ہو سکا میں چالور کی بھاگ کر سوچتا آیا اور یہاں

مجھے معلوم ہوا کہ بانی جی اب شادی کے لئے ہر چہاڑوے دباؤ ڈال کر راضی کر لی گئی ہیں اور شادی کی تاریخ مقرر ہونا باقی ہے۔

میرزا ہر کو شیش بانی جی کو خط پہنچانے یا ان کا صحیح حال معلوم کر نیکے لئے بیکار ثابت ہوئی۔ آخر شش وہ دن آیا کہ محل توپوں کی گرج سے گونجنے لگا۔ کوئی بات کی شادی بانی جی سے ہو گئی ہیں مڑ تہارہ گیا۔ اور اُس نے جاڑی کو بغیر لڑے بھرے فتح کر لیا مگر نہیں۔ کیونکہ ممکن تھا میں تو ابھی زندہ تھا۔

صبح تین بجے شادی ہوئی تھی جس کا توپوں نے اعلان کیا تھا۔ میں نے پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ رات ہی کو چل کھڑا ہوا محل کیا تھا ایک سنگین قلعہ تھا مجھے یہ قلعہ فتح کرنا تھا۔

میں قلعہ کی پشت پر پہنچا چٹان پھیل کر دیوار کی طرح کر دی گئی تھی اور مجھے اس پر چڑھنا تھا۔ لہجے کی کیلیں گاڑ گاڑ کر بڑی محنت سے میں چٹان کا بائیرین حصہ مزے میں چڑھ گیا۔ اس کے بچھڑ دشاؤں اور اراؤں خطرناک راستہ تھا۔ تمام چٹانوں کی چڑی لگ رہی تھیں اور تین مقامات مجھے ایسے

چلے کرنا پڑے، جہاں میں دیوار سے چٹ کر گلہری کی طح گزرا۔ صبح ہوئی اور صبح
 غل رہا تھا اور میں نے شاید ایک چوتھائی حصہ مسافت بھی طے نہ کیا تھا۔ دو گنہ
 کی بلندی پر پہنچنے میں مجھے پورے تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ گھنٹہ بھر
 بچا ہی سامنے کھیتوں میں آدمی آجائیں گے۔ لہذا جلد سے جلد مجھے ایک منزل
 اور چڑھ جانا چاہئے جہاں میں پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ گھنٹہ بھر کی سخت
 مشقت اور محنت کے بعد میں اس قلعہ کی پشت کی چٹان کی ایک منزل اور طر کر چکا تھا
 یہاں سے میں بڑی تیزی کے ساتھ دیوار سے لگا لگا دوڑ تک چلا گیا اور یہی
 جگہ پہنچ گیا جہاں سے قلعہ کی تعمیر شروع ہوئی تھی۔ اس جگہ تھوڑا اور
 دو ستر چھاونی درختوں کی دو چار جھاڑیاں تھیں اور شام تک میں آرام سے جگہ سو گیا۔
 میں اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی لایا تھا اور تھوڑا سا کھانا۔ جب رات ایک گھڑی
 آئی تو میں نے کمر سے کمنہ نکال لیا تھا۔ نکال کر فیصل پر مارا۔ دوسری کوشش پر کمنہ
 ہوئی اور پشیم زرد میں دیوار پر پہنچا اور کمنہ ہی کے ذریعہ آہستہ سے لٹک کر
 اندر پہنچ گیا۔ میں جس جگہ پہنچا ہوں، یہ محل کے باغ کا سب سے اچھا حصہ تھا
 اور جہاں میں ٹھہرا تھا اس جگہ سے سامنے بلندی پر درگم محل چمک رہا تھا۔ راستے میں پتھر اور
 مٹی کے غلط انسان ٹیلے تھے جو محل کی گڑھی تک بلندی ہوتے چلے گئے تھے۔

میں تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ رنگ محل کے ارد گرد کو بنا دو کا سخت پہرہ ہر کوئی آدھ گھنٹہ تک ادھر ادھر پھرتا رہا مگر کسی طرف سے مجھے راہ نہ ملی اور میں مجبور و اچانک ہو کر رنگ محل کی پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا اور وہاں سے میں نے نظر رنگ محل کے پھاٹک پر جا دی تاکہ جس وقت کو بناوت اندر داخل ہو تو محل میں گھس جاؤں۔

آدھی رات کے قریب محل کے صادر دروازے پر سینکڑوں مشعلوں کی روشنی نظر پڑی ہیں جاننا تھا کہ سب پہرہ داخل وقت اس تیز روشنی کو دیکھتے ہوئے وہی موقعہ بھٹکے گا اور مجھے ایسا بھی کہانا پھیرے میں میرے چلنے کی اگر آہٹ بھی کسی نے سُن لی اور روشنی کی طرف سے نظر ہٹا کر انا پھیرے میں اگر مجھے دیکھنا چاہے گا تو مائے چکا چوند کے خاک بھی نہ دیکھ سکے گا۔

مشعلچیوں کے جلوس کے ساتھ کو بناوت پوری رٹھوری شان سے اپنے مسلح سپاہیوں کے داخل ہوا ہر پہرے دار قہر زامتا شاید کھنے کو نہ صرف اپنی جگہ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا بلکہ اپنے قریب والے کے پاس پہنچ گیا تاکہ اپنے سزا پر بھی طرح رائے زنی کر سکے۔ اس زربین موقع سے میں نے فائدہ اٹھایا اور ڈبیری صفائی محل میں داخل ہو گیا۔ سب راستے میرے دیکھ ہوئے تھے۔ اس طرف

اول تو ویسے بھی روشنی کم تھی اور جو دو چار شمعیں تھیں اُن کو میں بجھا تا ہوا نشت کے زینے سے محل کی پہلی منزل پر پہنچا۔ اور وہاں سے ایک کھڑکی میں سے نکل کر چھتے پر پہنچا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ جالیوں میں پیر رکھتا ہوا اور چھجوں کو کپڑا ہوا محل کے بلند ترین حصے یعنی تیسری منزل کی دُھر چھت پر جا پہنچا۔ اس چھت کے سچوں بیچ میں ایک بڑا سا روشنہ ان تھا جس کے اوپر ایک چھتری سی بنی ہوئی تھی۔ میں اس چھتری میں گھس گیا اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ میں نے اندر بھانک کے دیکھا۔

شروع جاڑوں کا موسم تھا۔ کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا اور جین دت میں نے جھانک کے دیکھا ہے تمام داؤڑھیاں اور خاتونگانیوں میں منہستی اور جیل کرتی کمرہ چھوڑ کر جا رہی تھیں کیونکہ کو بننا دتا رہا تھا چتم زن میں کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔ بلکہ چاروں طرف سامنے چھت پر بے بھیس عورتیں نیچے چلی گئیں اور سناٹا پھا گیا۔ کافی دیر ہو گئی اور سناٹا بدستور باک اُتے میں ایک سہر سمرٹ کے ساتھ جا لیجے جی مجھے نظر آئی۔ سارا کمرہ چھاڑوں اور کنول کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ عود، اگر اور لوبان کی خوشبوؤں سے سارا کمرہ جبکہ رہا تھا۔ اور جا لیجے جی جُن مجھ سولہ نگہار کے آراستہ وپیرستہ، بال بال مونی پروئے کو بناوت

کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس کے حسین اور خوبصورت چہرہ کو غور سے جھار دیا اور ناندیوں کی روشنی میں دیکھا۔ جُن خوبصورتی کے نور سے سارا چہرہ بکھر کر رہا تھا۔ اور ایک لرباسی رنگی اُس کے چہرے پر اس طرح سُٹا تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے اندر وہی جذبہ بات کو پاگل کرنے کے لئے تھے طبعیت کی گراںبازی کا اثر بوجہ دُشمن و سنگھار کے چہرے پر تھا۔ آنکھیں جلدی جلدی جھپک کر طبعیت کے اندر وہی انتظار کو ہویا۔ اگر رہی تھیں کہ اتنے میں کھسکا ہوا۔ جا بجا جی کے چہرے پر ایک سبکی سی چمک گئی۔ کو بناوت آگیا، دروازے میں داخل ہوا۔ بڑی آہٹ سے نشانہ ارماتہ بانٹے ہیرے کی کلغی لگائے نہایت شان سے دو لہا بنا دیا ہوا جا بجا جی نے نرم سے سر جھکایا اور تھوڑا سا ٹرگئی۔ کو بناوت آہستہ سے اور گونہ احترام کے ساتھ جا بجا جی کی طرف بڑھا۔ اور جا بجا جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکایا ہی تھا کہ بچوں بچ کرے میں نرم نرم غانچوں پر میں ایک دم سے کود پڑا۔ اور اٹھٹھ اٹھٹھے میں نے کہا "خبردار"

ایک بجلی تھی جو دھنسا جا بجا جی اور کو بناوت پر گری۔ منہ سے ایک بی ہوئی چیخ نکلی اور کو بناوت بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر پُرزور مگر خاموش لہجے میں کو بناوت سے کہا "خبردار! ابھی میں زندہ ہوں میں نہتا تیرے سامنے کھڑا ہوں"

پہلے میرے خون سے ہاتھ رنگ لے۔“ اور جاڑ پچی جی سے میں نے کہا: ”دیکھو یہ تمہارے سامنے کھڑا ہے جس نے مجھ سے مقابلہ کرنے سے انکار کیا۔ یہ بزدل ہے جس نے اپنے نوکروں سے میرے اوپر بڑبڑے سے حملہ کر لیا اور پھر میرے سامنے سے بھاگ گیا۔“ پھر کو بناوت کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”کنور صاحب! میں فوت نہ ہوتا کھڑا ہوں جو کچھ کرنا ہے کر لیجئے، اور میں آپ کے مُنہ پر کہتا ہوں کہ ان کو تم نے اپنے پیسے اور آدمیوں کے زور سے بیسنا چاہا ہاؤ مگر تم نے دیکھ لیا کہ میں موجود ہوں۔“

جاڑ پچی جی نے کو بناوت کی طرف دیکھا۔ چونکہ میں نے سچ کہا تھا اور وہ بُلا میرے کہنے کی تکذیب کی متوقع تھی لہذا میں نے موقع کو دیکھتے ہوئے کو بناوت سے کہا: ”کو بناوت تم راجپوت ہو جھوٹ نہیں بولو گے۔ لیکن اگر جھوٹ بول کر اپنی بات اوچی کر گئی چاہتے ہو تو تمہیں اختیار ہے جو میں نے الزام دیے ہیں ان سے یا انکار کر دیا اقرار۔ اگر انکار کرو تو میں ابھی چلا جاؤنگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اب پھر تم کو ابھی مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں۔ تم مجھ سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے ہو۔ لہذا یا تو مجھ سے مقابلہ کرو ورنہ کہہ دو کہ مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور میں جب چاپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ تم لو ازخحال کر ابھی

میرا حاتمہ کر دو۔ یا ذلیل نوکروں کے ہاتھوں مجھے قتل کر دے تم جانے ہو کہ ان تین باتوں میں سے راجپوت کس کو پسند کرتا ہے، مجھے جلدی جواب دو تا کہ قصہ ختم ہو۔“

کو بناوت بھی آخر راجپوت تھا۔ اُسکی دولت اُس کی بیوی کے سامنے ہوئی تھی۔ طیش میں آکر اُس نے اپنی سر وہی اور تلوار نکال کر فرش پر پھینک دی اور مجھ سے کہا۔ ان دونوں میں سے چاہے سر وہی لے لے چاہے تلوار اور آج امیر کے سامنے۔“

میں نے سر وہی اٹھا لی اور اُس نے تلوار ڈھال دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھی۔ میں نے تجویز کی کہ سہری کے گول تکیے بجائے ڈھال کے مناسب ہوں گے۔ چنانچہ ایک تکیہ میں نے لے لیا اور ایک اُس نے ہم دونوں آگے سامنے آئے اور اس وقت میری نظر چاڑھی جی کی نظروں سے چادریں میرے دل میں ایک برجھی سی لگی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ گویا وہ میرے طرز عمل کی دل میں شاکی ہے کہ میں نے اُس کے جملہ عروسی کو میب۔ ابن قتال بنا دیا۔ ایک دم سے میرا دل ڈوب گیا اور میں نے سر وہی اور تکیہ پھینک دیا۔ اور چاڑھی جی سے نرمی سے کہا۔ ”چاڑھی جی مجھے معاف کرنا۔ میں نے خود غرضی کی۔ اگر کو بناوت میرا تھا تو نیز کر سکتا اور مجھ سے ڈرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تمہاری زندگی تاراج

کرنے کے لئے اس طرح اٹھوں، لہذا میں جاتا ہوں یہ کہہ کر میں پلٹا کہ ایک بارم سے
 ایک کر کو نباؤ، ت نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا ”او میٹر نبھا! جانا کہاں ہے؟“ تو یہ
 چاہتا ہے کہ میرے منہ پر کا لک لگا کر رفو چکر ہو جائے، اٹھا سر وہی ”یہ کہہ کر
 مجھے آگے کو کھینچ لیا۔ میں نے پھر انکار کیا اور چپ کھڑا جاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔
 کو نباؤ نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر مجھے جھڑکی دی اور سر وہی اٹھا کر میرے ہاتھ
 میں دی۔ تکیہ میں نے خود جھک کر اٹھا لیا اور ہم دونوں اپنی اپنی تلوار کا قبضہ چمک
 اور جوش جواںی میں جھوم کئے بڑھے۔ اور بے شری جاڑی چھی جی، ”میرے منہ سے نکلا
 اچو شرم زردن بنی تلواریں چمکنے لگیں۔ جاڑی چھی جی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔
 اور وہ پریشان ہو کر مسہری پر بیٹھ گئی اور ہماری جنگ کو دیکھنے لگی۔

کو نباؤ ت بزدل نہ تھا، ابیر تھا تلوار کا بھی دھنی تھا زیادہ تر ہم دونوں کے
 دار خالی جا رہے تھے کیونکہ دھال نہ ہونے سبب ہم دونوں ایک دوسرے سے
 باصلہ رہنے پر مجبور تھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو

لے سر یہی بہ نسبت تلوار کے زیادہ جھرا رہ رہی ہوتی ہے۔ راجپوت عموماً تلوار
 کی بجائے سر وہی اور کھاناڈا زیادہ پشہا کرتے ہیں۔

ہلکے ہلکے دھم بھونچا ہے میرے سب پر تلوار کی نوک اُچھتی ہوئی تھی اور کو بناوت کے
کے کنارے سے پر لگی تھی۔ یہ پچھتاہٹا جاتا تھا اور کبھی وہ ہٹتا چلا جاتا تھا۔ ایک
نفعہ وہ مجھے ہٹاتا چلا گیا اور ایک دم سے اٹھیں کہ میرے سر پر ایک سخت ضرب لگائی
میں نے تلوار والے ہاتھ اور تکیے والے ہاتھ دونوں طاقتور تھکے سے وار کو روکا۔ ستر
تھکے والے ہاتھ کی میری ہڈی اڑ گئی اور تھیلی کٹ گئی۔ مجھے دائیں طرف اُچھل کے
آنا پڑا۔ کو بناوت نے بھی میٹر بدلا اور اب ہم دونوں اس طرح آمنے سامنے
تھے کہ جاڑی جی کی مسہری کو بناوت کی پشت کی طرف تھی اور میرے مقابل میں
تھی لیکن اس میٹر سے پہلے ہی کو بناوت نے پھر ایک بھر پور ہاتھ مارا۔ میں نے
یہ ہاتھ تلوار سے روکا اور روکتے ہی میں نے ٹھوٹ کے ہاتھ شروع کر دیئے ایسے
کہ تین قائم کو بناوت کو بچھے ہٹنا پڑا۔ اور سر تبا کر جو میں نے کو بناوت کے سینے میں
سر وہی کا ہولا دیا ہے تو اس نے تھیم سے روکا۔ سر وہی بیکہ کو چھید کر سینے کو توڑتی
ہوئی پار لگ گئی اور کو بناوت میرے ہولے کے زور سے جاڑی جی کے پاس ہی
مسہری پر گر آ جاڑی جی کے منہ سے ایک چمچ لگی۔ میں نے سر وہی ہاتھ سے چھوڑ دی
تھی جو کو بناوت کے دل میں ٹھکی کی ٹھکی رہ گئی تھی۔ کو بناوت نے شکل دو تین چکیاں
لیں اور حستہ ہو گیا۔ مجھ اعروسی میں خون ہی خون تھا اور مسہری کے ریشمیں بستر پر

خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ جاڑی جی اومیں دونوں بیہوش تھے کھڑے تھے اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کتہہ ہو گیا۔ میری نظریں چارہ چوہیں اور اس نے بھڑائی ہوئی آوازیں کہا۔ ”امراجم نے مجھے بیوہ کر دیا۔“

”ہرگز نہیں“ میں نے کہا۔ ”ہرگز نہیں“ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ تم میری ہوا میں تمہارا ہوں جبر اور دباؤ سے شادی نہیں ہوتی۔ کو بیاد توں کے برتنوں کے اشوک پڑھ دینے یا ہون کر دینے سے شادی نہیں ہو سکتی۔ بہت اتم بیوہ نہیں ہو۔“

جاڑی نے کہا نہیں تم غلط کہتے ہو۔ مجھے کو بیاد سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہو سکتی تھی اور یہ بھی تسلیم ہے کہ میری شادی زبردستی کی گئی۔ مگر میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتی کہ کو بیاد سے مر گیا اور میں بیوہ نہیں ہوئی۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اور چونکہ وہ محبت لافانی تھی بہت اذاب بھی بہت سہولتیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں کو بیاد سے بیوہ نہیں اور اس کی لاش کے سات نہ مل مروں۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“

اُس نے کہا۔ امراتی ہی ہو گا اور میں تمہیں اپنی لازوال محبت کا واسطہ دیکھ رہی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے ایک سچی راجپوتنی کی طرح کو بیاد سے کی

لاش کے ساتھ جل مرنے دو تم جاؤ یہاں سے جلدی جاؤ۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔“

میں نے کہا: ”کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بے لگھی زندہ رہ سکوں گا۔“
جاڑی جی نے کہا: ”میں جانتی ہوں کہ دنیا کے پردے پر بس وقت مجھ سے محبت کرنے والا تم سے زیادہ کوئی نہیں ہے اور یہی میری نشا ہے کہ میرے بے میری محبت میں تم برسوں بتیاب ہو کر ٹھہری کی طرح تڑپتے رہو، تاکہ میری روح کو راحت پہنچتی ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں میرے لئے اب صرف یہی امر باعث تسکین ہو سکتا ہے کہ میرے عشق میں تم ساری عمر جلتے رہو، اب تم جاؤ یہاں سے اور مجھ سے دعا کرو کہ مجھ کبھی نہ جیو لوگے اور مجھے یاد کرنے کے لئے عرصہ دراز تک زندہ رہو گے۔ بس جاؤ اب جاؤ..... جاؤ جلدی جاؤ..... جاؤ جاڑی جی کی آواز بھرائی، مگر میں کیسے جاتا۔

”تم جاؤ“ اُس نے پھر کہا: ”تم جاؤ..... جاؤ.....“ اور یہ کہنے کہنے کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اُس نے اپنے اپنے ہاتھ کی کلائی سے اپنی آنکھیں چھ پالیں اور روتی ہوئی پٹھلے کھاتی ہوئی آواز سے کہا: ”..... جا.....“

جتم زندن میں ہیں بھی رو رہا تھا وہ بھی رو رہی تھی اور ہائیں ہاتھ سے مجھے

بھوپس کے مرغوعے کس قدر اُس کے لئے تکلیف دہ تھے بھیکے کے بھیکے اُس

کے حسین اور خوبصورت چہرے کی طرف بڑھ کر اُس کی آنکھیں پھوڑے دیتے تھے کہ دھوپیں کی سیاہی میں اُس کا چہرہ چھپ گیا۔ گویا چاند ریاہ بدلی میں تھا۔ میں نے بتیاب ہو کر دل میں کہا ”میں سے تم ایسے چھپی ہوئے ہو جیسے چاند چھپے۔“ ”انہی بھری بدری“ وہ یاد لوں میں چھپی ہی تھی کہ..... الامان..... ایک غمناک ”بھٹکے“ کے ساتھ جو گرجے مشابہ بھی ایک دم سے اُک بھڑک اُٹھی۔ دھول غائب تھا اور اُس کا چاند سا چہرہ چمکا ہی تھا کہ شلوں نے ایک خون کا تھپک ساتھ اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی آلتیشن چاؤر نہیں لپیٹ لیا۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے دیکتے انکا روز پر کسی نے خوبصورت تلی ڈال دی تھی۔ تھوڑے تھوڑے اور کانپ کر رہ گئی۔ اوپر شمع زردن میں جا بڑی کاترن ناز میں ایک سنگینی ہوئی پھیلا نک لاش تھا میری ایک دم سے آنکھیں پھوڑیں اور میں یاد لوں کی طرح ایک سمت دوڑا چلا گیا۔

ر جائی بھی نہ ہو گئی مگر اُس نے نہ تو یہ بتایا کہ کوئی بات کا تامل کون تھا اور نہ یہ بتایا کہ قتل کس طرح ہوا۔

(۵)

دور و نزدیک میں نے کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ چار گھنٹے کی لازوال محبت کا دیر تھا

کہ میں اُس میں ڈوب کر رہ گیا۔ لیکن افسوس صد افسوس جیف ہو جا رہی تھی کہ
 حُسن دھو اتنی پرکھائی گئی تھی و محبت کی میں نے ذرا پروانہ کی اور چشمِ زدن میں
 اُس کی نامِ راجو انا اور پتے عشق و محبت کی پاک یاد کو نہ صرف دل سے مٹا دیا
 بلکہ پتے پتے لفظ ”محبت“ کو میں نے خونوں سے روند ڈالا۔

میں نے متاثر ہو کر جبریت سے پوچھا: ”وہ کیسے؟“ حالانکہ میں نے آپ کی
 زبانی اس نامِ راجو کا قصہ سنا ہو مگر میں صبحِ عرض کرتا ہوں کہ جا رہی جی کی عجیب
 غریب محبت کی داستان میرے دل سے کبھی غائب ہوگی پھر یہ کیسے ممکن ہے
 کہ آپ نے اس کو بھلا دیا.....“

”نہیں نہیں۔ بھلا نہیں دیا بلکہ اُس کی محبت کو پامال کر ڈالا اور پھر سکی.....“
 سا دھونے کچھ کہتے کہتے زبانِ روک لی اور پھر رُک کر کہا۔ لیا سب کو کہ میں
 نے کس طرح جا رہی تھی جی کی محبت کا خون کیا۔

بانی شہر می بھیبانی جی

”میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ ٹھکانہ بڑھو
کے موضع کا نوٹری کا میٹر تیار امر سنگھ راتھو رہتا ہے اسے سانسے بیٹھا ہے، نہ بیٹا
وہ گاؤں ہے کہ مٹ گیا۔“

میں نے کہا: ”ہے میں جانتا ہوں۔“

”اچھا۔ تو اُسی گاؤں کا رہنے والا ہوں اور وہاں سے کچھ حاصل
پر موضع سُجّان گڑھ ہے۔“

میں نے کہا میں سُجّان گڑھ کو بھی جانتا ہوں بلکہ وہاں تو کسی ذنیہ گیا

۱۵ راجپوتوں کی قوم بھائی۔

بھی ہوں :-

ر دھونے کہا: ”میرا ایک جگر ہی دوسرے میں تباہ خواہ سنگھ تھی بتو جت سے میں دیوانہ وار اپنے گاؤں بھاگا اور یہاں جنجا رسنگھ کی صحبت نے بہت کچھ غم غلط کر دیا۔ جنجا رسنگھ بڑا زناہرہ دل اور شیطانی تھا اور پرہیزگار میرا سنا سا ساتھ رہنے لگا۔ گو میرا دل دینا کی کسی چیز میں نہ لگتا تھا اور ہر دوسرے جانتی تھی جی کی عناناک چین صورت سامنے رہتی تھی، لیکن جنجا رسنگھ کی زناہرہ دماغ کم از کم ایک وقتی و لبتگی بن کر سکون پسند کر دیتی تھی۔

جاڑی جی کو بھیم ہوئے جو تھا جہینہ چلتا تھا کہ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم دونوں شکار کو گئے۔ ہم دونوں گھوڑوں پر تھے اور مارا و رونہ (علامہ اونٹ پر تھا۔ شکار وغیرہ قتل نہیں اور ہم لوٹنے والے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ دو اونٹ چلے آ رہے ہیں۔ آگے کے اونٹ پر ایک راجپوت بیٹھا تھا، پیچھے کے اونٹ پر دو پردہ پوش عورتیں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ایک آدمی تھا جو دروندہ معلوم ہوتا تھا۔

آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ راجپوتوں کو اس میں مزہ آتا تھا کہ راستہ چلتے خوشیاں ادا کی سے بھر پڑیں۔ یا زیر کر کے اس کا مال و اسباب بھین میں یہ

ڈاکہ نہیں تھا بلکہ خوشی کا سودا تھا جس کا جی چاہے ہماری سوانی مان لے اور
 ہاتھ جوڑ کر مزے میں چلا جائے ورنہ ہم سے لڑے۔ مائے پامرتے۔
 جیخارست نگھنے اونٹوں کو دیکھتے ہی کہا: ”آہا ہا ہا! چلو ان سے سوانی
 منو! میں کہنے کی دیر تھی کہ گھوڑوں کو ہم نے ہمیں کیا اور تلو اور سونت کہ
 اونٹوں کا راستہ نہ کاٹ کر کھڑے ہو گئے۔“

یہ دیکھتے ہی آگے دے اونٹ پر سے تڑپ کر راجپوت بچے کو کووٹرا اور
 کڑک کر اس نے ہماری گٹائی کی وجہ پوچھی۔ ہم نے بتا دیا کہ ہم سوانی منوانے آئے ہیں۔
 یہ سن کر اس نے پوچھا تم کون ہو؟
 میں نے جواب دیا: ”میسرتیا“

جیخارست نگھنے اس کو چھڑنے کی عرض سے کہا: ”میسرتیوں کی سوانی مان لینے
 میں تو ہیں نہیں ہوتی۔“

راجپوت نے طنز سے سر کو جنبش دیکر کہا: ”متھانبہ کہے جو ہان تو نے نہیں دیکھے
 ہوں گے“ عورتوں نے اے اونٹ کی طرف اس نے انگلی اٹھا کر کہا: ”راجا پشور کی

۱۵ یعنی تم میرا دم سوا میرا دم سے بھاری ہیں۔ ۱۶ جو دھپور کا ایک بھڑا سا گاؤں

ٹھکانی مہری ہیں چو ہانی جی اور اُس کی لڑکی ہے۔ اور کیا بہتر نہ ہو کہ ایک چو ہانی تمہیں چوتیاں مار کے بھگادے۔ کل کے فوٹو ہے چو ہانوں سے موٹی منوانے آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر ہم دونوں کی طرف تھارت سے دیکھ کر اپنا کھانا ایمان میں رکھنے لگا۔

میں نے کہا: ”ٹھا کراں۔۔۔ یہ کھانا اکیلا کپے گا؟ اس کو میان ہی کیا بغیر خون چٹائے بغیر رکھو گے ایسے تیروں کا خون تقاریر والے کھانا ہے ہی کو ہلتا ہی معلوم ہوتا ہے تمہارے کھانا ہے نئے باب مکھیل بانٹیوں ہی کا خون چکھا ہے۔۔۔۔۔ لے اپنا کا لوبیدھی طرح کھانا اپنا ورنہ ہم لے جاتے ہیں چو ہانی جی کو۔“
یہ سنتے ہی بھالی تو بھائی خود ہیں یعنی چو ہانی اونٹ پر سے لٹکاری دے۔
”ہے ٹھا کراں!۔۔۔۔۔ رنجھے تو دے سروچی“ اپنے دروغہ سے بولی
اور لٹکار کر کہا: ”جھکا دے اونٹ

لے باہی بھی بھیلوں کی طرح خینگی مگر ازل تو م ہے۔
سہ مارواڑی زبان میں داچار کیلے جینے جمع ہوتے ہیں تو مراد اجرام اور عزت ہوتی ہے
سہ بٹھا دے۔

اور اونٹ کے جھکے جھکے چوہائی نے دروغہ کے کھرپکے سے سر ہی سونٹ لی اور پوری راجپوتی شان سے پردے کو خیر باد کہا چادر سے خوبصورت چہرہ نکلا اور ایک طرف کاٹا۔ ہسے چادر سرک کر نیچے آئی اور اونٹ پر سے بیٹھ ہی بیٹھے اُس نے دونوں پیر ایک طرف کئے۔ اور ہم دونوں کو چیلنج کیا اور اپنے بھائی کو ڈپٹا جو کھانا ٹاسے سے ہمارے اوپر حملہ کرتے کو تھا۔

مگر میں تو اب کسی اور ہی طرف متوجہ تھا۔ ٹھکانے کی خوبصورت نوجوان لڑکی جو اُن کے آگے مٹھی تھی ایک نر باسادگی کے۔ اتھ اپنی ماں کے کندھے کی طرف سے منہ پر سے چادر ہٹائے دیکھنے لگی اور میں اس کے ملکوتی حسن سے متاثر ہو کر ادھر دیکھنے لگا۔

ہم نے ٹھکانے کی صاحب کے ہاتھ چڑ کر کہا: ”ماتا جی ہم آپ سے نہیں لڑتے۔ نہ ہم آپ سے سواری منواتے ہیں۔ ہم تو آپ کے بھائی کے سواری منواتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی تلوار نیام کھینچی اور چوہان کی طرف بڑھ کر ڈپٹ کر کہا: ”پھوڑ دے اپنا کھانا..... دالہ دے کھانا۔ سواری میری ہے۔“

چوہان نے ٹھکانے سے اپنا کھانا کھینچا اور دو ہتھ تان کر پیڑا، لکڑی کھڑا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس خوفناک کھانا دے کی سیڑھیں ہیں کیا کوئی بھی آتا تو دو ہو جاتے۔

لہذا میں نے بابک ہاتھ سے زمین پر سے ریت اٹھا لی اور عواہنے ہاتھ میں تلواریں
 بٹھکاتے ہوئے چوہان کے سُنہ پر پھینکنا شروع کی یہ کہہ کر کہ تلواریں میری سوائی
 مان میری سوائی کی۔“

چوہان اُگ بگولا ہو گیا اور اُس نے ایک دم سے گویا اُٹ کر ایک زور کی
 جھپٹ کے ساتھ اس زور سے کھانٹے کا دو تہتر دبا ہو کر اگ بچا نہ جاؤں تو دوڑ
 ہو جائیگی۔ میں نے تڑپ کر کھانا ڈھالی دیا اور اُس صفائی سے تلواریں چمکادی کہ
 بھر پور ہاتھ چوہان کے داہنے شانے پر پڑا خون کا فوارہ نکلا چوہان کے ہاتھ سے
 کھانا اچھوٹ گیا۔ میں نے تلواریں کر کے نعرہ مارا۔ ”زور بٹھکایا اٹھو۔۔۔۔۔ بول
 سوائی میٹر تیا کی۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر میں چوہانی کے دروغہ کی طرف پہنچا۔

چوہانی جی کا دروغہ سہم گیا اور میری تلواریں کی چمک سے وہ بول اٹھا۔
 ”سوائی ہے میٹر تیا۔۔۔۔۔ سرداراں رھی۔۔۔۔۔“

ایک تو بھائی کا زخمی ہو کر گرنا اور دوسرے دروغہ کا ہماری سوائی
 مان لینا چوہانی نے غصیناک شیرنی کی طرح شکست کی چوٹ سے بیتاب ہو کر

لے لٹھوڑوں کا قومی نعرہ یعنی لٹھوڑوں کا بانگ اُٹھایا۔
 بلکہ معنی کی۔

ایک چنیے کے ساتھ خود اپنے دروغ پر سرور ہی کا دار کر دیا۔ اس نے کیوں ہماری سوانحی مان لی اور جاؤ نہ تھی ہوئی۔ سرور ہی ہاتھ میں خون قاتان نظر سے ہمیں دیکھتی ہوئی اپنے بھائی کی طرف چلی۔ جو زخم کے صدمہ سے بیہوش پڑ تھا۔ چوہانی کی ماہیکر صاحبزادی صاحبہ بھی ماں کے ساتھ ماموں کی تیار داری کو پڑھیں۔ میں تو اس شعلہ خن کی جینٹوں کو دیکھ کر بیہوش سا ہو کر رہ گیا۔ بال بیٹیاں قریب پہنچیں اور چوہانی نے بھائی کا زخم دیکھتے ہوئے اپنے دروغ کو آواز دی کہ پانی کی چھاگل لائے۔ اُس غریبہ کی پشت میں سرور ہی کا اچھا سا زخم لگا تھا۔ وہ اُس کی دیکھ بھال میں مشغول تھا۔ میں نے دوڑ کر اونٹ پر سے چھاگل کھولی اور لاکر چوہانی جی کو دی۔

مغرور ٹھکرانی نے تیور بدل کر چھاگل لی مگر جل کر کہا: ”ٹھاگل تمہارا
سے جاؤ۔ چٹ پڑے۔“

ہم دونوں ذرا ہٹ آئے اور ہم نے دیکھا کہ ماں بیٹیوں نے کپڑے پٹا کر زخم کھولا۔ دونوں کے خوبصورت ہاتھ خون میں لال ہو گئے۔ ابھی ہم دونوں اس بارہ خن کو دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ٹھکرانی کو یہ نظارہ بازی بہت نہ تھیں اور اُس نے اب جھڑک کر ہم سے جانے کو کہا۔ ہم نے اب ٹھکرانہ مناسبت

بھھا اور ٹھکرائی کی طرف ہاتھ جوڑ کر ”جے شری ماتا“ کہہ کہہ لے کر ایک کمرے میں ”اور یہ کہہ کر میں اپنے شکست خوردہ دشمن کا کھانا لینے جھکا۔ فتح کی نشانی دشمن کی تلوار بھٹی تی ہو ٹھکرائی اپنے بھائی کو چھوڑ کر چرچ کر اٹھی اور کھانا اڑا اپنے قبضہ میں کر کے ہمیں ایک پٹ دی کہ چھاگو۔ ہم نے کہا کہ جانے دو کھانا اور ”بیک“ کی ہے دوبارہ کہہ ایک کمرے سے سامنے سے گردوغبار کا طوفان اور بوجھوں کے شگنی نعروں کی آواز آئی سر اٹھا کر جو دیکھتے ہیں تو چھ سوار چلے آ رہے ہیں ٹھکرائی کا چہرہ فق ہو گیا۔ بھائی کی تیار داری چھوڑ کر اس نے ماتھا اپنا پیٹ لیا۔ اپنی خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا کہ اپنے انٹ کے پاس آئی کہ اتنے میں سوار قریب ہی آ گئے۔ ان کا سردار بھاری بھر کم آ دی کوئی ۵۳ برس کی عمر تھی ہیکل سیاہ تمام۔ بائیں گچھڑی سر پہ۔ کان میں مندر سے بٹے۔ اس نے شاید ہمیں چوہانی جی کا آ دی بھھا اور کوٹ کر بولنا مان سولی جو دھوں کی..... لاؤ میری ٹھیکانی“ یہ کہہ کر اس نے دوشیزہ کی طرف اس طرح گھوڑ کر دیکھا کہ میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ نظریں کہہ رہی تھیں کہ کیا معاملہ ہے لڑکی کو لینا چاہتا ہی یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ان لوگوں کو جانتا ہے و نیز یہ چوہانی جی

کے ٹھاکر بھائی ہیں۔

”ٹھاکرانی نے بھرائی ہوئی آواز سے اُس سے کہا۔ ”خیریت چاہتا ہو تو بول جا۔“
اپنی بیٹی کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”مجھے یہ زمانہ نہیں مل سکتی۔“
میں نے کوٹ کر کہا۔ ”تم کون ہو؟“

خوفناک جو دھے نے کہا۔ ”اے چھو کرے لاؤنوں کے جو دھنوں کو نہیں
جانتا۔ (دروغہ کی طرف انگلی اٹھا کر) یہ میری ہے۔ تو کون ہے؟ دروغہ ہے
چوہانی جی کا؟“

بس یہ کہنا تھا کہ غضب ہو گیا۔ خیار سنگھ کا اور میرا اس طعنہ پر راجپوتی خون
کھولی گیا میں نے اپنے دروغہ کو گالی دے کر کہا۔ ”لاؤ تو میرا کھانا پلاؤ اور
پھر ہم دونوں نے اس خوفناک جو دھے کی طرف دانستہ پس کر کہا۔ ”جو دھنوں
کے دروغہ را بھڑ تو جا۔“

چوہانی کا دروغہ ہمیں ہمت نہ دے گا۔ سوئی شری میٹریاں ری
اُدھر اُس خونی جو دھے نے جنیش کی ٹھاکرانی نے جھٹ سے اپنی خوبصورت

۱۵ لاؤنوں نے غصہ سے ٹھکانا جو دھو رہی۔

اڑکی کے ہاتھ سے کنگن اتار کر سامنے ریت پر پھینک دیا۔ اور ہماری طرف دیکھ کر خوشی بکھاری۔ ”مے تیر تیا بھائیوں کا کنگن۔ دیکھو تو یہی بھائیوں کا کنگن جو دھو جو دھو سے کیسے جیتا ہے۔ اس کنگن کی اور میٹر تیں کے کھانڈے کی طرح آج تو تیرے ہاتھ ہے (اڑکی کا ننگا ہاتھ اونچا کر کے بولی) یہ بھٹیانی تیری ہے۔ دیکھتا کیا ہے سامنے کنگن پڑا اٹھا کر پہنا دے۔“

ایسا خود سوچے کبیرا کیا حال ہوا ہوگا۔ دوشیزہ بھٹیانی سے جو میری آنکھ ملی ہے تو اس کی خوبصورت آنکھوں نے کہا۔ یا کہ میں تیری اونٹاری ہوں میرا نونکا ہاتھ ہے اس میں کنگن پہنا دے۔
میں تیزی سے کنگن کی طرف بڑھا۔

جو دھانے لگا کر کہا۔ ”اودروغے! خبردار! کنگن میرا ہے یہ کہہ کر اپنے گھوٹے پر سے کود پڑا اور کھانڈا لے کر آگے بڑھا جس نے اپنا کھانڈا پیچھے چھینکا اور اپنے دروغ سے ڈھال لی اور لڑھوری اڑا۔ چونک کے آگے بڑھا۔
دیو پیکر جو دھانے پتیرا بال کر اپنا کھانڈا اتولا اور آگے سرک کر تھک گیا

۱۔ یہ نہایت ہلکی تلو اس ہے جو سروی سے بھی زیادہ خمدار ہوتی ہے۔

چشمِ زند میں گزرنی طرح اُس نے میرے سر پر کھانا ڈرے کا: اڑکیا میں نے کھانا ڈالا
 ڈھال پر لیا اُلجھا دے ساتھ کمال بڑی پھرتی سے اپنا اونا چکایا۔ مگر جو دھامس
 بچا گیا۔ دونوں پیچھے بٹے۔ جو دھامس سمجھ گیا کہ اس پھرتی کے راجپوت کے خلاف کھانا ڈالا
 کام نہیں دے گا۔ لہذا اُس نے کھانا ڈال چھینک کر اپنی تلوار سوتی اُس کے دروغہ
 نے پک کر کھانا ڈالنا اسٹھالا اور ڈھال ہاتھ میں دیدی اور اب جو دھانے میرے اوپر
 وار کرنے شروع کئے۔ بہت زدی۔ ہر منترہ پر جو دھے کا قلم آگے تھا اور میں پیچھے
 سر کٹنے پر مجبور تھا۔ جو دھانے کا تینا ٹپ ٹپ کر میری ڈھال پر گر رہا تھا۔ ہر دھامس پر
 معلوم ہوتا کہ میرے دو ہوجائیں گے مگر ڈھال موقع پر پہنچ جاتی۔ اُس وقت
 اُس جبین دوشیزہ کا عجیب حال تھا خوبصورت ہونٹ حیرت اور تعجب سے ذرا
 کھلے ہوئے۔ اُس کو خبر بھی نہیں کہ چادر سرک کر کاٹھ سے گر چکی ہے اور چاند سا
 چہرہ کھلا ہوا ہے۔ وہ تو جنگ کی کشمکش دیکھ رہی تھی۔ تلوار کی ہر ضرب پر اُس کے
 خوبصورت اور جبین چہرے کے ذرات سُسن لڑ جاتے تھے۔

جو دھانے میرے سر پر ضربوں کی بارش کر دی تھی۔ جھنا جھن جھنا جھن جو دھانے
 کی تلوار میری ڈھال پر ٹپ ٹپ کر رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے جو دھانے پہلے حلیہ کا زور شور کھٹکا معلوم ہوا ضربات کی برق

نفاذی ذرا ہلکی بڑی میرا پیچھے ہٹنا ذرا کم ہوا۔ کہ جو دھانے مکر تبا کر ایک وار جو کیلے تو کو اوجھا پڑا۔ مگر کچھ ہی کاٹ کر تبا کر میرے سر پہ نہ لگا۔ دے مئی اور چشم زدن میں میرے سر سے بہہ کر خون چہرے پر آنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ نوجوان بھٹیانی کا چہرہ رنج و غم سے لرز کر رہ گیا۔ مگر نہیں۔ میرے بدن میں کافی خون تھا۔ اب دیکھ جان اور مضبوط بھی تھا اور میری ہمت اور قوت میں ذرا فرق نہ آیا۔ گو میں برابر مارنا نہ خنک کر رہا تھا۔ منہ پر سے خون آتا وہ کندھے سے اپنے پوچھا جاتا تھا مگر جو دھاک خوناک تیغ بابتلوڑ پٹ پٹ کر میرے سر پہ گر رہا تھا کہ اتنے میں جو دھاکا دوسرا دار میرے کندھے پر لگا۔ مگر ڈھال پر سے اوجھٹ کر لگا۔ لہذا اوجھا پڑا مگر تبا کر گوشت میں ضرور گھس گئی۔ اب مجھے ڈر لگا کہ کہیں مار نہ کھا جاؤ دو تیرہ اور اس کی ماں کی حالت قابل رحم تھی۔

مگر خوناک جو دھاک بھی شل ہو گیا تھا۔ مسلسل تلوار چلانا آسان نہیں ہے۔ ایک لمحہ کا اُس کو آرام نہ ملا تھا۔ اُس کو نہیں معلوم تھا کہ میں اسکو تھکا دوں گا۔ اور دراصل وہ اب ہانپ رہا تھا۔ میں دراصل باوجود اپنے زخموں کے بازو دم تھا۔ جو دھاکے ہاتھ میں تھی اگئی اس کی ضرب ایک گونہ کیلف اور سستی کے ساتھ پڑ رہی تھی اور جو دھانے اب دیکھ لیا کہ اگر اور کچھ دیر یہی حال رہا تو ایسا شل ہو جائیگا

کہ اٹھا تا دوشو ار ہو گا۔ غایب یہی سوچ کر اور اپنی شکست سے ڈر کر ایب اُس نے اور جال چلی۔

• میں نے ایب ہننا بند کر دیا تھا اور چٹان کی طرح ڈٹا کھڑا تھا کہ جو دھالنے ایک دم سے نعرہ مار کر ایک بہر دست وار کیا اور ساتھ ہی اچھل کر اپنی ڈھال کی اوچھڑ میرے منہ پر ماری۔ جو دھال کی ڈھال کے سچوں بیچ میں ایک بانٹ بیجھکا برچھا لگا ہوا تھا کہ بچانے اور مارنے دونوں کام میں آ سکے۔

یہ نے دار کو تو ڈھال پر گناٹھا اور ڈھال کی اوچھڑ سے بچنے کو پیچھے اڑا اور اڑتے ہی میں نے جو دھال کے بائیں شانہ پر ایسا جنیو کا ہاتھ دیا کہ اُونجا جو دھال کی اپیلی پر جا کر رکا۔ جو دھال کے ہاتھ سے ڈھال اور تلوار گری اور گرتے گرتے میں نے اُونے سے ایک طمانچہ کا ہاتھ جو دیا ہے تو رخسار کاٹتا ہوا اُونجا کر جو دھا گئے دوسرے گال کی ہڈی پر بولا۔

بیاختہ دونوں ماں بیٹیوں کے منہ سے نکلا۔

”جے سوائی مٹری میٹر تیاے کھا ٹھادی“

میں نے نعرہ مارا ”رٹ رٹ بٹھا را مٹھور“ اور دیوانہ وار دوڑ کر اونا پھینک کر اپنا کھانا دیا اور اُس میں لنگس پر و کرنا چنے لگا جو دھالوں میں سے کسی کی ہمت نہ تھی

آگے بڑھا۔

”جے شری میٹر تیا کھانا اری“ جنجا رسنگھ نے نعرہ مارا۔
میں نے اپنا کھانا مارا بلنا کیا جو کنگن پہنے ہوئے تھا۔ جنجا رسنگھ دوڑ کر
چوہانی جی کے پاس آیا۔ اور دوشیزہ کا دھنسا ہاتھ پڑ کر اُس نے کھنچا اور مجھے
آواز دی۔ دوشیزہ شرمائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی میں اگڑا
مسکد ابھمیا نی کے پاس پہنچا۔ اُس نے میری طرف محبت بھری نگاہوں سے
دیکھا اور میں نے پچھرتی سے اپنے کھانڈے میں سے کنگن نکال کر اپنی محبت بہ کے
نازک اور خوبصورت ہاتھ میں پہنا دیا۔ اور اُس کا ہاتھ اٹھا کر احترام سے اپنی
آنکھوں سے لٹکا کر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اور چھوڑے ہی کھانا لیکر ہم دونوں گھوم
کر اس طرف متوجہ ہوئے اور لٹکا کر ہم نے دکن سواروں سے کہا:-

”بول سوائی شری میٹر تیاں اری؟“

ہم چار آدمی تھے۔ دونوں ہم اور دو ہمارے دروغہ۔ اور پانچویں ٹھکرانی
چوہانی جی جن کے ہاتھ میں سروی بھی۔
دُشمن نے ہماری سوائی نہ مانی اور ہم دونوں لپکے اپنے گھوڑوں کی طرف
اور دروغہ کو آواز دی کہ لانا بھیجی۔

مگر جو دھوں کی بہت بہت تھی غالباً ان میں سہا بھی اور زور وغہ تھے سب کے سب دم دیا کر بھاگے اور ہم نے اپنے جے کاروں سے ریگستان سر پر اٹھا لیا۔

”جے سوانی شری میٹریاں رے کھا اڑاری“

(۷)

اس شعلہ نوجوان بھٹیانی نے دم کے دم میں مجھے دیا نہ کر دیا۔ ڈبو کر رکھ دیا۔ کہاں کی جاڑی جی اور کیسی جاڑی کچی جی۔ موہنی سو رت چکے ہوئے ”اونے“ کی طرح دل میں گھپ کر رہ گئی..... جاڑی کچی کی محبت پامال کر ڈالی!.... جیف صد جیف۔ راجپوت بھی کیسا ظالم ہوتا ہے.....“

اتنا کہہ کر سادھو ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ میں نے بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا کہ وہ خود ہی بولا:-

”..... جاڑی کچی جی بیشک راجپوتی صُن و خوبصورتی کا بہترین نمونہ تھی لیکن بھٹیانی اور ہی چیز تھی میں کیا کہوں ایسی شکل شاید ایک ہزار برس میں راجپوتانہ پیش نہ کر سکے گا۔ تھہ ٹھہر صورت کل تھی اُس کی کہ صُن کی تصویر جس کی نظریں اپنے محبوب مرد کے کلیجہ میں اتر جاتی تھیں۔ جو دھانے جو اپنی ڈھال کی برہمی

کا ہولا دیا تھا وہ میری ٹھوڑی کے پنجے لگا۔ بہت خفیف سا زخم تھا۔ سر کا زخم بھی کچھ زائد نہ تھا۔ اب سب سے پہلے تو ٹھکرائی نے اپنے بھائی کی مرنے پڑی کی ان کا نام رام سنگھ چوہان تھا۔ چوہان کے ریشمی دوپٹے اور رومالوں کو جلا کر خم میں رکھا گیا۔ رام سنگھ جی کو ہوش آگیا تھا مگر قہامتھی میرے سر میں بھی ریشم بھر دیا گیا اور کنا۔ بے پرین پڑا یا نہ دیا گیا۔

ٹھکرائی نے مجھ سے کہا۔ ”آج میڑتیوں کے کھانڈے نے بجاٹیوں کا کنگن جیت لیا ہے لٹھوڑے“ یہ (اپنی مٹی کی طرف اشارہ کر کے) بھٹیانی اب تیری اوتیرے کھانڈے کی چیرتی ہے۔ تو جان اوتیرے کھانڈے کی کمانی۔ جی چاہے بھی اپنی جیتی ہوئی کمانی اپنے گھوڑے پر بٹھا کر گھر لے جا اور جی چاہے میرے گھر چل اور دیکھ کہ راجا دیشور کی ٹھکرائی اپنی مٹی کو کیا دا بجا (دھنڑیسی چھنڑا دیتی ہے) یہ سنتے ہی مارے خوشی کے میری جان کھینچے گی۔ دل میں محبت کا درد سا ہونے لگا اور میں خوشی کے لہجہ میں بولا۔ مجھے ”دا بجا بھا بجا“ کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے تو میری بھٹیانی دیا۔“

یہ کہہ کر میں نے نوجوان بھٹیانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ نوجوان دوشیزہ نے شرمناک اپنی ماں کی چادر کو کچھڑا اور جگہ سے نہ ہلی۔ مایہ شرم کے گرمی جانے لگی کہ میں نے نہیں کر کہا۔ ”لے جاتا ہوں اپنی بھٹیانی رانی۔“ اور یہ کہہ کر میں نے گود میں لیکر پھول کی طرح اپنی بھٹیانی کو اٹھا کر اپنے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ نوجوان دوشیزہ منہ پھپھکا کر رونے لگی اور ٹھکرائی کی آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ حینا رست گکھ نے کھڑا ٹھکرائی کے قریب کر دیا۔ ماں بٹی کو دلاسا دینے لگی۔ اور چمکا کر کر سمجھانے لگی۔ میری تو یہی مرضی تھی کہ اپنی دہن کو لے کر ابھی لوٹ جاؤں کہ ٹھکرائی کچھ متفکر سی رہ گئی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ راجلہ ریشور نکلتی بھائی کو لے جانا نہ صرف مشکل ہو گا بلکہ جو دھوں کے حملے کا خطرہ بھی ہو گا۔ یہ جو دھا جو مارا گیا ٹھکرائی کا بڑا زبردست دشمن تھا۔ لہذا یہ بات طے ہوئی کہ ہم دونوں راجلہ ریشور چلیں ٹھکرائی اور بھی خوش تھی کہ اپنی لڑکی کو ٹھاٹھ کیسا تھ رخصت کر کے گی۔

میں نے مقول کا ٹھکانا اپنے دروغہ اور ڈھال وغیرہ اور نہ یور جو کچھ بھی تھا ٹھکرائی کے دروغہ کو انعام میں دیدیا۔

(۸)

جو تھے روزنم راجلہ ریشور پہونچے اور فوراً طے کیا کہ میری دہن رخصت

کر دی جائے۔

الغرض سادی کی محفل گرم ہوئی بھائیوں کے چاہنے اور بھاٹ چنگ لے کر آگئے۔ بھائیوں اور میزبانیوں کی تلواروں کے اذانے چنگ پر اڑنے لگے۔ بھائی دو آتشہ کے جام پی۔ پی کر بھو منے لگے۔ جلدی بن رنگ پر آیا میں دھوا بنا بیٹھا تھا اور پھر نے پرنے والے ہی تھے کہ میز تیسے سیر ہی بہن کا دروغہ ایک ایسی سادہ لایا کہ بس غضب ہی ہو گیا۔

وہ خبر وحشت اثر یہ تھی کہ جے پور کے کچھ لوگ اور مرہٹوں کے دانے میز پر نہ لوٹا۔ افسوس یہ آگ دی ہی اور راتھو۔ میوں کو چن چن کر کے سیرا بیچ ڈالا اور خود میری بہن کے پاس بک گئی۔

۱۷ راجپوتوں کے نئی شاعر۔

۱۷ جے پور کا پیرا افسانہ میزبانی کے نام سے موسوم ہے۔

۱۷ کے میں بچنے سے مطلب یہ کہ قصہ فتح کر کے پیرا افسانہ نام رکھ دینوں تو نہ ہر باہر لیا گیا کہ عورت نہیں جاتی تھا اس نام چادر کو اپنے قینہ میں کر لیا اور نہیں دھوا پڑا پڑا کہ راتھو راتھو کے خیال میں جلیو لیتے۔ چنانچہ دعوتوں کے (باتی منوہ پڑا)

خدا کی پناہ! کیسی رنج فرسا اور لرزادینے والی خبر تھی ایسے غصّے کے میرا
 مُتہ لال ہو گیا، بھائیوں کی بھری محفل میں میری انگلی جو جس غضب سے دیوانہ ہو کر
 میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ بے اپنے کی اُٹھ کھائی اور فوراً میں نے اور خجاستہ گھر نے اپنے
 اپنے کھاناؤں کے نیام توڑ ڈالتا کہ اب ہمارے کھانا بڑے تو کچھ اویں اور مرچوں
 کے بدینہ پر رہیں گے میں نے اپنا کھانا مانت پر کھا دیکھتے سے لگا کر بطور اپنے
 تمام مقام کے رکھ دیا۔ اگلے سے ہمارا دوسرے سہرا آتا، کہ اپنے کھانا بڑے کو
 پہنا دیا اور کہا کہ میں اپنی بہن کی مدد کو جاتا ہوں میری جگہ یہ میرا کھانا بڑے ہے۔

(صفحہ ۱۰۱ سے آگے) رشتہ دار جا کر فی عورت ایک کھانا اہل کس کے چڑلاتے تھے۔ بہنیں ہوتا
 تھا کہ عورت کو کوئی دوسرا آدمی لے جائے صرف گھر کے مرد اپنی عورتوں کو چڑلاتے تھے
 یہ کارروائی محض توہین کی غرض سے کی جاتی تھی اور اس کا نام رواج تھا۔

۱۰ کھانا بڑے کے پھیرے سے جائز شادی ہو جاتی ہے پہلے زمانے میں اکثر دواہا اپنی
 بجائے اپنا کھانا اُدھن کے گھر بھیجتا تھا اور کھانا اُدھن کی طرح من پر رکھ دیا جاتا تھا
 اور بالکل میں بھی دواہا کی طرح جاتا تھا اور اُدھن کھانا بڑے کے ساتھ رخصت ہو جاتی
 تھی۔ بہت جگہ اب بھی یہی دستور ہے۔

دہن اس کے ساتھ پھیرے کھائے گی اور اپنے سسر اور ساس سے میں نے اجازت چاہی۔

قصہ مختصر میں اور خجیا رستنگھ دونوں کے دونوں فیورائے کے فیور اپنی بہنوں کی عزت کا بدلہ لینے کی قسم کھا کر شادی کی مجلس سے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر ایک عظیم الشان فوت تبھی جس نے مجھے گویا چلتے چلتے لمحہ بھر کے لئے روک لیا۔ جنگ پر جاتا ہوں، نہ معلوم بوٹوں یا نہ بوٹوں۔ کم سے کم اپنی بھینائی کو تو ایک دفعہ اور ردیجھ لوں۔ چنانچہ خجیا رستنگھ کے دوبعد سے میں نے خفیہ طور پر اپنی اس خواہش کو اپنی ساس چوہانی جی پر ظاہر کر دیا۔ چوہانی جی نے میری التجا منظور کر لی اور نہ بھی کیوں کریں۔ انہوں نے تو مجھے میرے کھانڈے کی کمائی فیورائے نور اہی سوپ دی تھی۔

آہستہ سے میں کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ پردے کو ہاتھ سے ہٹایا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ روشنی میں چمک رہا ہے اور ایک خوبصورت مہری برہینائی ننگینے کی طرح پڑی چمک رہی تھی۔ پردہ اٹھاتے ہی اُس نے میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی آئی پھر میرے دل پر ایک بجلی کو نہ کر

گری۔ ایک وارفتگی کے عالم میں بدیاب ہو کر میں اپکا اور اپنی خوبصورت بھٹیانی کو پتھر پتھر سے چٹایا اور.....!

خدا کی پناہ بخورت، ایک پُرسوں مگر خاموش اور دلکش راگنی ہو جس کی ہر جنبش ایک دلہ وزان ہے۔ بھٹیانی نے اپنی پوری سحر کارانہ قوت کے ساتھ انتہائی محبت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا نہیں بلکہ واقعہ یہ تھا کہ تارِ نظر کے ذریعہ اپنے ہوش رُباط قوتوں کے میرے دل میں اتر گئی۔ آہ میرے دل میں جو جس محبت سے دردسا ہوتا معلوم دیا، ایسا کہ پتھر پتھر میرا سن تیزی سے چلنے لگا اور میں نے دردِ محبت کی ٹیس سے بدیاب ہو کر اُستہ سے بھٹیانی کو اپنے کلیجہ سے در اعلیٰ کیا۔

بھٹیانی نے شرم سے اپنی محبت آمیز نظریں نیچی کر لیں اور میں نے دیکھا کہ عشق و محبت کا نور کس طرح اُس کے سین اور پر فسون چہرے کی چاندنی پر غلطان ہے۔

بھٹیانی نے پھر اپنے سردار کو ایک نظر دیکھا اور پھر آہستہ سے آنکھیں بچی کر لیں۔ میں نے مختصر سی باتیں کیں۔ بھٹیانی نے چند الفاظ میں اُن کا جواب دیا۔ ہر جواب محبت کی ایک طولانی داستان تھا یہ واقعہ تھا کہ اگر بھٹیانی نے

اپنے محبت کے جادو سے دیوانہ کر دیا تھا تو میں نے بھی اُس کے تن بدن میں اُس پھونکنے لگی تھی۔

وقت کم تھا اور ہم دونوں جب راہو لے میں نے پھر بھٹکیا کو گلے سے لگا لیا اور پر سچ اُسکو ماہی ہے آب کی طرح تڑپتا چھوڑا۔
باہر جو نکلا ہوں تو میری عجیب حالت تھی۔ جیسا کہ میں انتظار ہی تھا۔
ہم دونوں نے فوراً ہی اپنے گھوڑے لئے اور روانہ ہو گئے
جو دروغہ پیغام لایا تھا اُس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ وہ میٹریوں کا جنگی
دھون کھانٹو کے کانٹھ کی طرف گرجتا چھوڑ کر اب اسے لہند اہم دونوں نے
بھی کھانٹو کا رخ کیا۔

جب ہم ہیراوتی کے کانٹھ دھکیل یا پس انداز پہنچے ہیں تو ہمیں اپنے
جنگی دھونے کی پہلی گرج سُنائی دی۔ اس گرج کے سُننے ہی ہم دونوں کے
منہ سے میا خستہ اپنا جنگی لغزہ نکلا۔

لے مارو ڈکا ایک گاؤں۔

”زیر تہکار اٹھو“

دھونے کی پہلی ہی گرن پر بقول کے میئر تبا اپنی دہن چھوڑ کر دھونے کی طرف دوڑتا ہے۔

تیسرے ہی دن ہم اپنے لشکر سے کھانے آگے جاتے۔ ہمارا لشکر سیاحانہ ڈنگانے کی طرف جا رہا تھا، جہاں دوسرے روز دشمنوں سے ہماری پہلی ٹکڑ ہوئی۔

دشمن کے لشکر کو ہم نے چشم زدن میں پاش پاش کر دیا اور اب ہمارا دھونہ خونی دیہ کی طرح گر جتا میشرین کو چار طرف سے اپنی جنگی آواز کے ساتھ کھینچنا میشرین کی طرف لئے جا رہا تھا۔

میشرین کے خونی کانٹوں پر ہمارا لشکر مریٹوں اور کچھو اہوں کے ہم غفر سے ٹکرایا۔ اور ڈھانی گھنٹہ کی انتہا سے زیادہ گھسان اور خونخاک مسل جنگ کے بعد ہم نے دشمن کو سخت شکست دی۔ اور کھیرے لکڑی کی طرح کاٹ کر دھڑیا اور خونی میدان پر ہم اور ہمارے بھائی میشرین دشمنوں کے خون میں نہاتے اپنے خونچکان کھانڈوں کو بلند کئے دشمنوں کے لاشوں کو حقارت سے روند رہے

۱۵ جو دھور ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔

تھے۔ اور ہمارا جگہ دھونس۔ ایک تختہ اور خون آستانہ دیو کی طرح اس بن خونی میدان
جگہ میں گرج رہا تھا۔

(۵)

یہ اتنی بے جا ہم دونوں صرف دو روز میڑتہ میں ٹہرے۔ اپنی بھٹیانی سے
ملنے کا شوق اس فتح سے اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لہذا جلد ہی پہنچنے کیلئے ہم نے
اپنے گھوڑے یہیں سے چھوڑے اور ایک صیاد رفتار سانڈنی کو لے کر ہم
دونوں ہوا کی طرح میڑتہ سے نکل گئے۔

فراقِ یار میں میرا بُرا حال تھا۔ دن و رات منہ نہیں پارتے ہم ہر اچلے شور
کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے ایک ناقابلِ بیان قوت بھی جو مجھے راجلڈینور کی
طرف کشاں کشاں بجلی کی تیزی سے لے جا رہی تھی۔ جب میں سو جان گیا تو پہونچا
ہوں تو رات کے دو بجے ہوں گے اور ہم نے یہاں تھوڑا آرام لینے کی
ٹہرائی ایک جان پہچان دوست کے یہاں ہم سو گئے۔ اور یہاں میں نے
پھر وہی خواب دیکھا۔

”کیا دیکھتا ہوں کہ عجیب نور کا عالم ہے۔ ایک بقعہ نور سا جنس میں آتا ہے۔“

ان میں سے بھٹیانی کا چہرہ اپنی تمام سُمن آرائیوں اور جلوہ آرائیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ ایک عشقِ تاباں ہے کہ سُمن لرزاں تہمت و متزلزل باکہ ایک دم چہرے پر ملوثی بخیر کی آتی ہے۔ جو میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دم سے جلالِ سُمن کی صورت بن جاتی ہے۔ ایک سُمن برہم ہے کہ سُمن جلالی کا نورانی پیکر۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ میرے مُنہ سے نکلتا ہے ”بھٹیانی“ اور اُس ”ظلم سامری“ کا داہنہا ماتھ اٹھتا ہے۔ کلمہ کی انگلی بلند ہوتی ہے اور ایک دم سے انگلی شمع کا فوری کی طرح مشتعل ہو جاتی ہے! خدا کی پناہ! انگلی کی عجیب و غریب نورانی روشنی سے بھٹیانی کا چہرہ ٹٹھا اٹھتا ہے بلکہ بھڑک اٹھتا ہے۔ میں بوجھتا ہوں ”یہ کیا؟“ ایک عجیب انداز سے بھٹیانی جواب دیتی ہے ”مے مرے سورا یہ تمہاری ہی محبت کی ابتدا ہے“۔۔۔۔۔ ایک چرخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے کہ خجائار سنگھ بھی جاگ اٹھا ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ پوچھت رہی تھی اور ہماری ساندنی وسیع میدان کی ریت میں ہوائی جہاز کی طرح اڑی چلی جا رہی تھی۔

ہم جلد از جلد راجپوت پور پہنچے۔ میں نے اپنے خواب کا حال خجائار سنگھ سے بھی نہیں بیان کیا تھا۔

ہجاری سانٹہ فی ٹھیک میری سُسرال کی پھانک پر رُکی اور اب میرے عزیز
میں تجھ سے اب کیا کہوں کہ ہم نے وہاں کیا دیکھا! جس وقت ہم پہونچے وہ پہر کا
وقت تھا۔ اور جو کچھ بھی ہم نے وہاں پہونچکر دیکھا یا سنا وہ بیان سے باہر ہے!
گھر ماتم کہہ دینا ہوا تھا اور ہم پہونچے ہی تو جو بھی وہاں موجود تھا اس پر بخلی گری
کیا یہ سب کچھ ممکن تھا! مگر ہاں واقعہ تو واقعہ ہی تھا! حیف صد حیف!

یہاں پہونچکر ضعیف العمر سا دھوکے دار بھڑکائی اُس کی خشک آنکھوں میں
نہی سی معلوم دی اور وہ رک گیا، اُس نے مجھ سے پانی کا اشارہ کیا۔ ساتھ
کی دیوار کی طرف اُس نے اشارہ کر کے مجھ سے ایک پتھر منانے کو کہا۔ میں تجھ
کیا میں نے پانی لینے کا کٹکول لیا اور پتھر کو یہ سمجھ کر ہٹایا کہ یہاں کوئی گھڑا رکھا
ہوگا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں پتھر کو ہٹایا تو روشنی نمودار
ہوئی اور اندر جھلک سا نظر پڑا۔ سامنے کوئی ڈیڑھ فٹ پہاڑی چشمتہ تھا جو تیزی
سے بہہ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو حیرت تو استعجاب کی حد نہ رہی۔ کوئی سو گڑ کا
لبا چوڑا اچھوٹا سا جنگل تھا جو چاروں طرف نہایت ہی بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا
تھا۔ نہ صرف اُس کی زمین میں بلکہ ہر چہار طرف دیواروں اور ٹیلیوں میں صد ہا درخت
تھے، جہاں امرود اور شربتھ اور ککروندوں کے درختوں کا جنگل تھا

نے جلد ہی جسے چشمہ کے شکول میں پانی بھرا اور لا کر سا دھو کو دیا۔ سا دھو نے دعاؤں کے ساتھ پانی لیا۔ ایک دو گھونٹ پی کر پیالہ رکھ دیا۔ پھر اپنا قصہ شروع کیا۔

ہمارے میسرے کی شان و شوکت کی خبر پہنچ چکی تھی۔ منکر آج ہی ایک دروغہ درنائی پر خبر لایا کہ میں لڑائی میں کام آگیا اور نوجوان بھٹیانی بیوہ ہو گئی۔ چنانچہ سن سنانی کے آتے ہی نوجوان بھٹیانی نے وہ چڑھائی لی جو دروغہ اور نائی یا تھا اور سستی ہونے وہ کب کی مسان پر پہنچی۔ بلکہ کیا عیسیٰ ہو بھی چکی۔

یہ خبر سنتے ہی میں سچ پچ پاگل ہو گیا اور ہم دیوانہ وار مسان کی طرف دوڑے جو شہر سے زیادہ دور نہ تھا۔ ایسے بے تحاشا دوڑے ہیں کہ کبھی نہ دوڑے ہوں گے ابھی لوگ اس طرف جا ہی رہے تھے کوئی انہیں رہا تھا لہذا تباہ ہوئی کہ ہم وقت پر پہنچ جائیں گے۔ یہ خیال کر کے اور بھی اس باختم ہو کر دوڑے اور چشم زدن میں مسان پر پہنچ گئے۔ ایک جم غفیر تھا اور ہمیں فوراً جیکاروں، دھم سے معلوم ہو گیا کہ بھٹیانی چتا پر چڑھ چکی ہے۔ یعنی چتا میں اس کو بٹھا کر آگ لگا دی جا چکی ہے۔ آسمان پر دھوئیں کے مرغولے اس کی تسبیح کرتے رہے۔ لیکن جلنے والی تک آگ ذرا دیر میں پہنچتی ہے۔

توپ کے گولے کی طرح دم دونوں عجیب کر دھکیلے ہوئے پسو پچے تو کیا دیکھتے
 ہیں کہ نور کے سانچے میں دھالی اور میری ونا دار بیوی بھٹیانی آگ کے سچوں نیچ
 میں بیٹھی ہے اور ہمارے دیکھتے ہی ایک دم سے وہ شعلوں میں لپٹ گئی۔
 میں نے بھٹیانی کو دیکھا اور اس نے مھکو..... کیسے ہم دونوں کی آنکھیں
 چارہ بیویں میں نے غم سے چھانی پٹلی اور سینے سے میرے ایک غم کی جینے علی
 کرکڑا! اور ادھر بھٹیانی کے محبت بھرے سینے سے ایک دلہ وزخچ لکلی ہے کہ
 چکیلا تیغا! ایک ہٹا سا ہوا..... اور عالم کائنات کے کٹ کر دو ہو گئے!
 بھٹیانی نے ٹرپ کر شعلوں سے نکلنے کی کوشش کی..... مگر بیکار اس کا آدھا
 جسم جل رہا تھا..... وہیں کی وہیں ٹرپ کر میری طرف دیکھتی رہ گئی اور موت
 اور مصیبت کی شدت سے ایک دم سے اس کا چہرہ خوفناک اور بھیاںک ہو گیا۔
 مجھ سے اماد کے لئے اس نے وحشت زدہ آنکھیں بھاڑ کر اور ٹرپ کر ایک اور
 دلہ وزخچ لگنا چاہی بھی کہ شعلوں نے اس زور سے اس کے معصوم اور نازک
 رخسار پر آگ کا خوفناک پھڑ لگائے کہ گال کی چٹری ادھر کر گڑی اور اس کا
 بدن وہیں تھر تھر کر رہ گیا جسم زون میں آگ کا ایک جہنم تھا کہ جوتیزی سے
 بڑھ رہا تھا اور اس میں کودنے کی میں ناکام کوشش کر رہا تھا میری آنکھیں بند

ہو گئیں اور میں بہوش ہو کر گر گیا۔

اس کے بعد میں کتنے دن تک دیوانہ وار گھومتا رہا اور کوئی قوت تھی جو مجھے اس جگہ لائی۔ مجھے ہوش آیا ستمبر ۱۸۱۵ء کی تاریخ سنی چیت بدھٹ تھی میں ہوش میں تھا اور میں نے آگ کو کوسا اور قیم کھائی
تو رانا ڈیا نہیں کھاؤں سامے واسیڈونٹہ
ماڈیٹھاں تو بالیاں بھٹیاں جی روٹہ

آج پونے دو سو برس ہونے آئے میں نے کوئی آگ کی پکی ہوئی چیز
نہیں کھائی مگر آج تک بھٹیاں جی کی محبت کی آگ میں برابر جل رہا ہوں اور
جاڑی جی اور بھٹیاں جی کی پاک اور متہ اس رو میں آج پونے دو سو برس سے
سوانح کی خاموش اور تاریک گھاؤں میں گھومتی رہتی ہیں۔ اور جب رات آتی
ہے تو میرے سامنے دونوں کی دونوں اپنی چٹاؤں پر بیٹھ کر آجاتی ہیں اور
یہ خوفناک ڈرامہ برابر جب سے روزانہ رات کو میرے سامنے ہوتا رہا ہے۔

لے لے بے غیرت واسیڈونٹہ آگ میں اب کبھی تیرا بچا ہوا نہیں کھاؤں گا (غضب ہو کر)
تو نے میرے دیکھتے دیکھتے بھٹیاں جی کی ڈیاں جلادیں۔

اور یہی راز ہے میری اس مُردہ زندگی کی طوالت کا۔ مگر اب میرے گناہوں کی شاید تلافی ہو چکے۔ اے میرے چینی عزیز وہ مٹی اور وہ لاشہ میں ہی ہوں مجھے جلانامت اور جس چشمہ سے پانی لائے ہو اسی میں مجھے لٹا دینا.....

جے ہو شری جاڑ پیجی جی گی

جے ہو شری بھٹیانی جی کی

خدا حافظ

سادھو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ مُردہ تھا۔ میں نے جلدی سے سادھو کی وصیت کی تعمیل کی اور جس قدر جلد ہو سکا غار سے نکل کر نیچے پہنچا۔

سو رنج ڈوب رہا تھا اور میں نے مُڑ کر دیکھا کیا دیکھتا ہوں کہ وہی سفید بلی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں نے قدم تیز کئے اور چرائے جلے اپنی جائے پیام پر تھا

————— (۱۰) —————

اب جس سے کہتا ہوں وہ یہی کہتا ہے کہ بھول کر بھی کبھی سوانہ کی گھٹاؤں کی طرف نہ جانا اور نہ ابھی زندہ ہونا مشکل ہے۔ کوئی کہتا ہوں مقامی

تخیل تھا اور کوئی کہتا ہے کہ ضرورتاً تم نے کوئی خواب دیکھا ہے اور میں کہتا ہوں
کہ واقعہ اور خواب میں فرق ہے اور جہاں تک میں غور کرتا ہوں یہ خواب
ہیں تھا۔ واللہ اعلم۔

﴿﴾

ختم شد

پرنٹروپ کٹیلینٹکو
مجاہد الدین ایف. آر. ایس. اے لندن
مطبوعہ نظامی پریس ہاؤس

